حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی و ادبی ماہ نامہ

سب رس

نومبر 2018ء
-/30 روپے
UGC'S Approved Urdu Journal-S.No.41103
ISSN-2278-6902

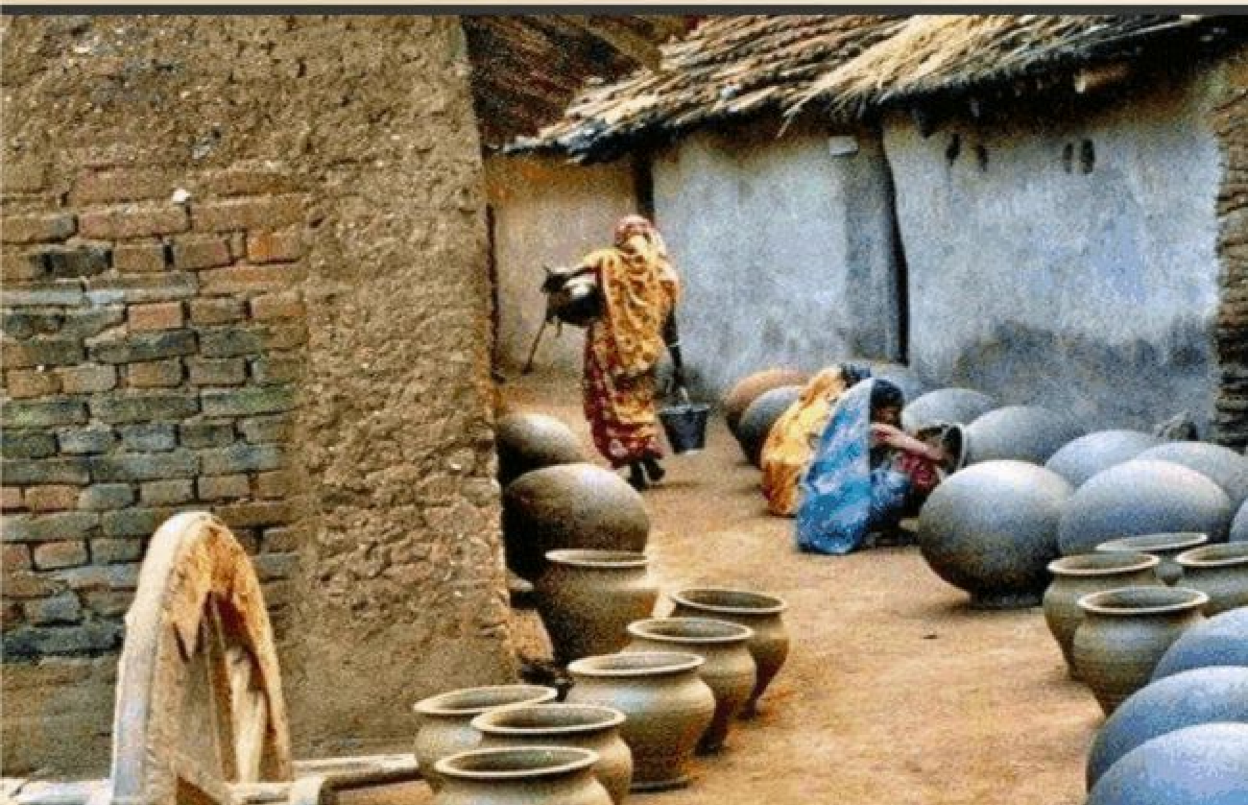

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی انجمن ریختہ گویان کی جانب سے سہ روزہ ادبی و ثقافتی مقابلہ جات کے انعامات کی تقسیم اور سہ ماہی ''ریختہ نامہ'' کی تقریب رسم اجراء سے خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں جناب محمد قمر الدین صدر نشین تلنگانہ اقلیتی کمیشن، جناب محمد عبدالرحیم خان مشیر اعلیٰ انجمن ریختہ گویان، مولانا مظفر علی صوفی ابو العلائی و دیگر اصحاب دیکھے جاسکتے ہیں

ساہتیہ اکادمی دہلی اور محفل نساء بنگلور کے باہمی اشتراک سے منعقدہ ایک روزہ سمپوزیم ''بیسویں صدی کے اہم اردو ناول'' کے دوسرے اجلاس میں جناب نور الحسنین، جناب رحمن عباس، پروفیسر بیگ احساس، جناب مرزا عزیز اللہ بیگ اور پروفیسر شہزاد انجم

بیادگار سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۸۰ شمارہ: ۱۱ ماہ: نومبر سال: ۲۰۱۸ء

مجلس ادارت

- سرپرست: راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرجی
- صدر: جناب زاہد علی خاں
- معتمد عمومی: پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور

مجلس مشاورت

- پروفیسر گوپی چند نارنگ
- جناب مجتبیٰ حسین
- پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

زرِسالانہ

قیمت: -/30

- ہندوستان: **300** روپے
- کتب خانوں سے: **400** روپے
- پاکستان و بنگلہ دیش: 600 روپے
- مغربی و عرب ممالک سے 60 ڈالر یا 40 پاؤنڈ

Phone: 040-23313311 **Editor: 9849256723** Fax: 040-23374448

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ: ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوما جی گوڑہ، حیدرآباد .500 082 انڈیا

برقی پتہ: *E-mail: idarasabras@yahoo.in*

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60 روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9032566731 / 9949303546 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور نے طٰہٰ پرنٹ سسٹمس، لکڑی کا پل میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

کلونجی

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کومحسوس کررہی ہیں۔

آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔

آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا من پسند اور آزمودہ نسخہ

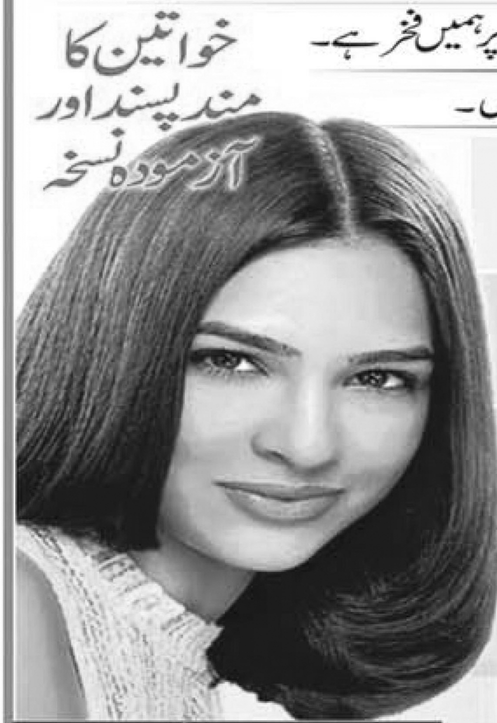

زم زم بہار ہیئر آئیل

• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفا دور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سردرد دوماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم

• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم

• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاوڈر

دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑ، منہ سے بدبو آنا وغیرہ میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

• کلونجی تیل • کلونجی مساج آئیل • کلونجی پین بام • سفوف ظہیر • اکسیر معدہ
• سفوف اپسرا • سفوف دمہ • کلونجی شوگر پاوڈر • کلونجی چیون پراش
• اکسیر جگر • معجون کلونجی • کلونجی شیمپو پاوڈر • مرہم کافوری • روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان

جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

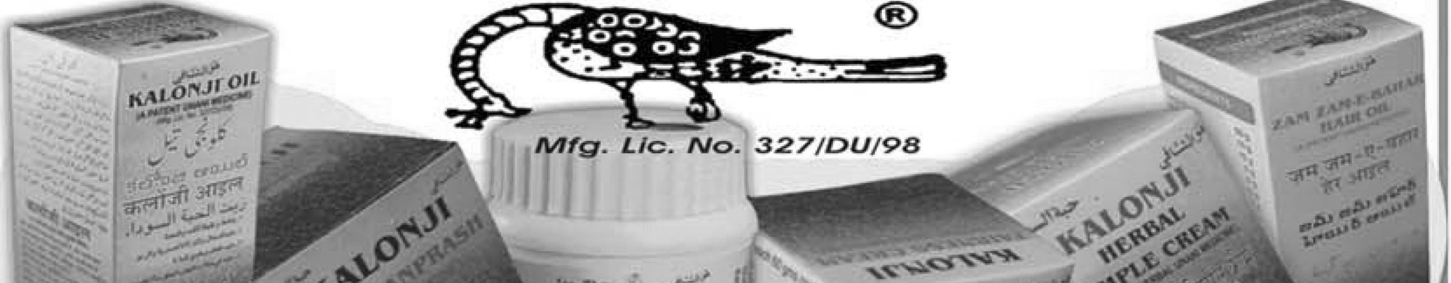

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS

Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES

Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.

Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

اس شمارے میں

اداریہ

اوراب مجسمے	بیگ احساس	6

مضامین

پروفیسر مسعود حسین خاں میرِ کارواں	اشرف رفیع	8
سرسید کے افکار اور جنوبی ہند	راہی فدائی	15
سید وحیدالدین سلیم کا تنقیدی شعور	عبیداللہ ہارون	24
جستجو کیا ہے	عائشہ شاہین	28

خصوصی مضمون

ابوالکلام آزاد اور حقوقِ نسواں	جاں نثار معین	33

ردِّعمل

نیا زاویۂ انفراد پر محتاط زاویۂ نگاہ	شمس الہدیٰ دریابادی	40

آپ بیتی

نواب اصغر حسین کی یادیں	راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر	45

خودنوشت

ڈگر سے ہٹ کر	سعیدہ بانو احمد	49

شاعری

کوثر صدیقی، اسلم حنیف، کشور سلطانہ، سلمان حامد، شہباز حسین، روحی حیات	فرحان مشتاق، انجیل صحیفہ، مصداق اعظمی	56

افسانے

احساس کا قتل	محمد طارق	63
رات کا آخری پہر	ناصر راہی	67
آخری منزل	تبسم زہرا	70

مطالعہ

گنجینۂ معنی کا طلسم	امتیاز احمد علیمی	76

جو وہ لکھیں گے جواب میں

خطوط	محتشم منیر، بدر ناصری، الطاف انجم، محمد مجاہد علی	79

اداریہ

اوراب مجسمے........!

وزیرآعظم نریندر مودی نے سردار پٹیل کا مجسمہ نصب کر دیا جو دنیا کا سب سے اونچا مجسمہ ہے۔امریکہ کے مجسمہ آزادی سے بھی اونچا۔سردار پٹیل کے اس مجسمے کو اسٹیچو آف یونیٹی (مجسمہ اتحاد) کا نام دیا گیا۔اس موقع پر وزیرآعظم نے اس بات پر فخر کیا کہ سردار پٹیل نے کئی ریاستوں میں بٹے ہندوستان کو متحد کیا۔اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ہندوستانیوں کو چار مینار دیکھنے کے لیے پاسپورٹ حاصل کرنا پڑتا۔ریاست حیدرآباد کو ہندوستان میں جس طرح ضم کیا گیا۔وہ تاریخ کا ایک ناخوشگوار باب ہے۔میر عثمان علی خاں آصف سابع نے ایک آزاد اور خودمختار ریاست کا خواب دیکھا تھا۔انگریزوں نے جاتے جاتے یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ ریاستیں چاہیں تو آزاد رہ سکتی ہیں۔ نظام حیدرآباد نے اس کے لیے قانون کے دائرے میں رہ کر کوشش کی۔لیکن قاسم روی اور رضا کاروں کی عاقبت نا اندیشی نے سردار پٹیل کو سخت اقدام پر مجبور کیا۔بات چیت کے ذریعہ بھی یہ مسئلہ حل ہوسکتا تھا لیکن باضابطہ فوج نے چڑھائی کر دی جذباتی رضا کار ٹینکوں کے سامنے لکڑیاں لے کر لڑنے چلے گئے۔بعض رضا کار ٹینکروں کے پہیوں سے لپٹ گئے۔پھر وہ ریاست جس کا حکمران ہندو مسلم کو اپنی دو آنکھیں کہتا تھا۔جس کی تعمیر کردہ عمارتوں سے ہندو مسلم کلچر کی عکاسی ہوتی ہے وہاں نفرت کا بیج بو دیا گیا۔اور تیس ہزار لاشوں کو عبور کر کے ریاست کو ضم کیا گیا۔نظام حیدرآباد کی فوج نے تو کوئی مدافعت نہیں کی پھر اتنے سخت اقدام کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی اس کا جواب آج تک نہیں ملا۔کشمیر کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے۔شیخ عبداللہ نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ جیل میں کاٹا۔نظام حیدرآباد اس عظیم سانحے کے بعد بھی ہندوستان کے وفادار رہے۔لال بہادر شاستری کے کہنے پر انھوں نے ہندوستان کو 500 ٹن سونے کا عطیہ دیا جو ایک ریکارڈ ہے۔ان باتوں کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ سردار پٹیل ہمیشہ کانگریسی رہے۔وہ نہرو اور گاندھی سے موانست رکھتے تھے۔سردار پٹیل آر ایس ایس اور ہندو مہاسبھا کے سخت خلاف تھے۔گاندھی جی کے قتل کے بعد آر ایس ایس نے باضابطہ خوشیاں منائیں۔سردار پٹیل اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ آر ایس ایس اور ہندو مہاسبھا گاندھی کے قتل کے ذمہ دار ہیں۔کانگریس کے لیڈر تو یہ بھی کہتے ہیں کہ سردار پٹیل نے آر ایس ایس پر پابندی عائد کی تھی۔

سردار پٹیل کا مجسمہ نصب کر کے مودی جی نے ایک تیر سے کئی شکار کیے۔یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ نظریاتی طور پر پٹیل آر ایس ایس اور ہندو مہاسبھا سے زیادہ قریب تھے۔انھوں نے پٹیل کو کانگریس سے چھیننے کی کوشش کی وہ کانگریس کا ردّعمل دیکھنا چاہتے ہیں۔یہ جتانا چاہتے ہیں کہ کانگریس نے ہمیشہ اپنے ہی خاندان کے افراد کو اہمیت دی۔سردار پٹیل اور مرار جی بھائی دیسائی کو وہ اہمیت نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے۔

بی جے پی کے پاس ایسا کوئی چہرہ نہیں ہے جسے وہ بطور رول ماڈل پیش کر سکیں۔مودی جی نے سردار پٹیل کا اونچا مجسمہ نصب کر کے نہرو کا قد چھوٹا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ مودی نہرو سے سخت نفرت کرتے ہیں۔مودی نے صاف صاف واضح کر دیا کہ یونیٹی کا مطلب قوم کی یونیٹی یا اتحاد نہیں بلکہ سردار پٹیل نے ریاستوں کو جو متحد کیا وہ یونیٹی ہے۔پچھلے برسوں میں جب سے مودی وزیرآعظم بنے ہیں انھوں نے قوم کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی ہر کوشش کی ہے۔اس مجسمے پر 3 ہزار کروڑ

روپے خرچ کیے گئے۔مجسمے کی دیکھ بھال اور حفاظت کے لیے ہر روز بارہ لاکھ سے زیادہ خرچ آئے گا۔کہا جار ہا ہے کہ اس مجسمے کی تیاری پر جو خرچ آیا وہ انڈین آئیل کمپنی او این جی سی، بھارت پٹرولیم، آئیل انڈیا کارپوریشن،گیس اتھارٹی آف انڈیا لمیٹیڈ اور پور گرڈ، گجرات منرلس ڈیولپمنٹ کارپوریشن، انجینئرز انڈیا، پٹرونیٹ انڈیا، اور بالمرلاری نے پورا کیا۔مودی جی نے انیل امبانی، مکیش امبانی، گوتم اڈانی یا بابا رام دیو کو زحمت نہیں دی، خرچ اٹھانے والوں میں زیادہ تر آئیل کمپنیاں ہیں۔اور ملک میں تیل کی قیمت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ایک طرف بے روزگاروں کو پکوڑے تلنے کا مشورہ دیا جارہا ہے۔روزی روٹی کے لیے لوگ بلک رہے ہیں۔کسان مقروض ہو کر خودکشی کر رہے ہیں۔اور مودی جی نے صنعت کاروں کا کڑوڑوں روپے کا قرض معاف کردیا تمام مقتدر اداروں پر کنٹرول حاصل کیا جارہا ہے۔اور پبلک سیکٹر کا پیسہ مجسموں پر برباد کیا جارہا ہے۔دوسری طرف رام مندر کے مسئلے کو گرمایا جارہا ہے۔یوگی جی ایودھیا میں رام کا مجسمہ بنانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ظاہر ہے بھگوان کا مجسمہ انسانوں کے مجسموں سے اونچا ہونا چاہیے۔یوگی جی ضرور یہ کوشش کریں گے۔بھوکے ننگے انسانوں پر نوٹ بندی اور جی ایس ٹی کا ظلم ڈھا کر پبلک سیکٹر کے روپیوں سے اونچے اونچے مجسمے کھڑے کر کے آخر برسر اقتدار پارٹی ملک کے عوام کی کون سی خدمت کر رہی ہے؟ کسی بھی پارٹی کو عوام کا پیسہ برباد کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟ انتخابات سامنے ہیں۔حکم ران پارٹی کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے وہ مجسمے بنا کر، اور نفرت کی سیاست کر کے کسی نہ کسی طرح اقتدار پر قایم رہنا چاہتی ہے۔اب یہ ہندوستانیوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ نفرت کی سیاست کو سختی سے رد کردیں اور ملک کی ترقی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچیں۔کوئی بھی سیاسی پارٹی دودھ کی دھلی نہیں ہے۔خراب اور بہت خراب میں انتخاب کرنا ہے۔اس لیے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔

حیدرآباد کے ممتاز شاعر و ماہر اقبالیات جناب مضطر مجاز کا 18/ اکتوبر کو بعد مغرب اچانک انتقال ہوگیا۔وہ 84 برس کے تھے ان کی ادبی خدمات چھ دہوں پر محیط ہے۔ان کی شعری تصانیف میں موسم سنگ، ایک سخن اور، ایک زخم نہاں، اور طلسم مجاز شامل ہیں۔شاعر مشرق علامہ اقبال کے فارسی کلام کا اردو ترجمہ ان کے ادبی سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔انہوں نے غالب کے فارسی کلام کا بھی ترجمہ کیا ہے۔انھیں کئی ایوارڈ سے نوازا گیا جن میں غالب ایوارڈ قابل ذکر ہے۔تدفین درگاہ حضرت اُجالے شاہ سے متصل قبرستان میں ہوئی۔

معروف ناول و افسانہ نگار پروفیسر قاضی عبدالستار کا طویل علالت کے بعد 29/ اکتوبر کو صبح 6 بجے گنگا رام ہسپتال دہلی میں انتقال ہوگیا۔اسی روز بعد نماز عصر ان کی تدفین علی گڑھ میں ہوئی۔قاضی صاحب ایک صاحب اسلوب فکشن نگار تھے۔قاضی عبدالستار ۱۹۳۲ء میں سیتا پور کے ایک قصبے مچھرنیہ میں پیدا ہوئے۔ان کے ناول شب گزیدہ، مجو بھیا، صلاح الدین ایوبی، بادل، غبار شب، دارشکوہ، غالب، حضرت جان، خالد بن ولید، تاجم سلطان بہت مشہور ہوئے۔افسانہ ''پیتل کا گھنٹہ'' کو بھی کافی شہرت حاصل ہوئی۔انھیں قومی اور عالمی سطح پر پدم شری، غالب ایوارڈ، بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، اقبال سمان جیسے اعزازات سے نوازا گیا۔قاضی صاحب اپنے خاص مزاج کی وجہ سے ادبی حلقوں اور اپنے شاگردوں میں بے حد مقبول تھے۔مزاحیہ شاعر چکر نظام آبادی اور ترقی پسند تحریک کے بزرگ فن کار عنایت اختر کا بھی انتقال ہوگیا۔اللہ مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ادارہ لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

بیگ احساس

اشرف رفیع

مضمون

پروفیسر مسعود حسین خاں میر کارواں

چالیس پینتالیس سال کی عمر ہوگی، سرخ و سفید رنگ، گہرے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس یورپین قسم کا آدمی صدر شعبہ کی کرسی پر براجمان تھا۔ ہاف ڈور کھلا تھا میں نے روم میں قدم رکھا۔ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئی۔ سوچا کسی غلط شعبے میں تو نہیں آ گئی۔ آواز آئی ''آیئے آیئے'' میں گئی داخلہ فارم سامنے رکھا۔ اس وقت اڈمیشن کا سارا کام صدر شعبہ ہی کے ذمہ تھا۔ فارم پڑھنے کے بعد فرمایا'' آپ سوشیالوجی سے ہی ایم اے مکمل کرلیتیں تو کہیں B.D.O. تو بن جاتیں۔ اردو سے ایم اے کر کے کیا کریں گی آپ''، استاد محترم ڈاکٹر حفیظ قتیل سامنے بیٹھے ہوئے تھے ان کی طرف دیکھ کر کہا'' کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد'' میں سماجیات سے ایم اے فائنل میں تھی۔ سال اول کے امتحان میں اچھے نشانات ملے تھے مجھے فری شپ اور برسری دونوں ملنا چاہیے تھا مگر صدر شعبہ کی نظر کرم کسی اور طرف تھی انہوں نے میرا نام صرف فری شپ کے لیے بھیجا۔ اسی زمانے میں مسعود صاحب کی آمد کے چرچے تھے۔ سبھی کہتے تھے ڈاکٹر ذاکر حسین کے بھتیجے اردو شعبہ کی صدارت کے لیے آئے ہیں۔ اردو والے کہتے تھے یہ غیر ملکی شعبہ اردو کو کیا سنبھال پائے گا یہاں تو دنیا بھر کے جھگڑے ہیں۔ ڈاکٹر حسن عسکری نے مجھے مشورہ دیا آپ کے لیے صحیح مقام شعبہ اردو میں ہے آپ وہیں چلے جائیں۔ پروفیسر مسعود حسین خاں ماہر لسانیات اب صدر شعبہ ہیں ان سے استفادہ کا آپ کا موقع ملے گا ایک سال کا نقصان ضرور ہوگا مگر بعد میں پچھتاوا نہیں ہوگا'' مجھے داخلہ مل گیا۔ جملہ بارہ طالب علم سال اول میں شریک تھے چار لڑکے جن میں عاتق شاہ، ڈاکٹر مصطفے کمال، شرف الدین اور حسینی، لڑکیوں میں میرے علاوہ نور جہاں، سیدہ زہرہ، صبیحہ جیلانی، فریدہ، ناصحہ نعیمہ اور آج کی کالم نگار اودھیش رانی گوڑ، اچھا بیاچ تھا۔ اکثر پروفیسر سلیمان اطہر جاوید پی ایچ ڈی اسکالر ڈاکٹر صاحب کے روم میں نظر آتے تھے۔ ان کی پی ایچ ڈی کا کام چل رہا تھا۔

مسعود صاحب تھے علیگی، وہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، وہیں سے پی ایچ ڈی کے لیے باہر گئے، مگر ان کا حیدرآباد سے دیرینہ اور گہرا تعلق رہا ہے۔ ان کی بڑی بہن خدیجہ بیگم صاحبہ مسجد ٹن پوش لال ٹیکری کے قریب رہتی تھیں۔ مسعود صاحب علی گڑھ سے آئے تو اپنی بہن ہی کے گھر میں قیام کیا کچھ ہی دنوں بعد یونیورسٹی کی طرف سے بنگلہ 18/AOS الاٹ ہوا۔ فیملی بھی آ گئی اس بنگلہ کے سامنے انجینئرنگ کالج ہے اونچی کرسی کا پرشکوہ بنگلہ آج بھی قایم ہے۔ مسعود صاحب کو شکایت تھی کہ بنگلہ خوبصورت ضرور ہے مگر اس میں مکانیت بہت کم ہے۔ صرف دو بڑے ہال، ایک کمرہ ایک ڈرائنگ روم، ڈرائنگ روم کو تو مسعود صاحب نے اپنی اسٹڈی بنالیا تھا۔ ملاقاتیوں سے اکثر سامنے والے وارانڈے ہی میں ملا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں کوئی وقت گزاری کے لیے نہیں آتا تھا۔ شعبے میں بھی وہ مجلس آرائی کے قائل نہیں تھے۔

مسعود صاحب کے پردادا غلام حسین خاں، آصفی فوج میں ملازم تھے۔ افسر الملک کے ساتھیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا یہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے وطن واپس ہو گئے مگر حیدرآباد سے اس خاندان کا ربط باقی رہا غلام حسین خاں کے دوسرے بیٹے اور مسعود صاحب کے دادا فدا حسین خاں بھی 1888ء

میں حیدرآباد آئے یہاں انہوں نے مرادآبادی سامان کی تجارت کی۔ ساتھ ساتھ وکالت کا امتحان کامیاب کیا۔ وکالت شروع کی خوب نام کمایا اور پیسہ بھی۔ حیدرآباد کے محلّہ بیگم بازار میں ایک دو منزلہ عمارت تعمیر کروائی۔ اوپری منزل میں اہل خانہ رہا کرتے تھے۔ نیچے کی منزل میں ایک پریس قایم کیا جس میں ان کی قانون کی کتابیں اور رسالہ آئین دکن طبع ہوتا تھا۔ ورود مسعود میں، پروفیسر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں کہ ''اسی دولت سے اپنے آبائی وطن قایم گنج میں دو گاؤں خریدے وہاں ایک پختہ حویلی تعمیر کروائی۔ اس حویلی کا مردانہ حصہ قائم گنج کی عام حویلیوں سے مختلف ہے۔ اس میں حیدرآبادی فن تعمیر کا ٹھاٹھ آ گیا ہے جس کی وجہ سے لوگوں نے اسے چھپن خاں کا محل یا صرف محل کے نام سے یاد کرنا شروع کیا۔ فدا حسین کے بڑے بھائی عطا حسین خاں نے بھی فوج میں ملازمت کی تھی اور رسالدار تھے۔ حیدرآباد آنے کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہی گیا مسعود حسین خاں صاحب کے والد مظفر حسین نے علی گڑھ سے بی اے اور ایل ایل بی کرنے کے بعد ریاست حیدرآباد آ گئے۔ کچھ دن اکبر یار جنگ کے ساتھ وکالت کی پھر ورنگل تبادلہ ہو گیا اور وہاں مجسٹریٹ کے عہدے تک ترقی کی۔ اقبال پر معرکتہ الآرا کتاب کے مصنف یوسف حسین خاں مسعود صاحب کے حقیقی چچا تھے عثمانیہ یونیورسٹی کے سررشتہ تالیف و ترجمہ سے وابستہ رہے تاریخ ہند (برطانوی دور) اور تاریخ دکن یہیں تصنیف کیں۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی سے ڈاکٹر صاحب کی نسبتی عزیزداری تھی عثمانیہ میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ کئی کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ تاریخ دکن کی کئی جلدیں اور قطب شاہیوں کی تاریخ لکھنے میں عمر کا ایک بڑا حصہ لگا دیا۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی کی علمی جہد و جہات سے مسعود صاحب بہت متاثر تھے ورود مسعود میں لکھتے ہیں۔

''انہیں دیکھ کر مجھے جامعہ عثمانیہ کی عظمت و جلال کا خیال آ جاتا تھا۔ سن رسیدگی کے باوجود ان کا علمی انہماک پرانے اہل علم کی یاد دلاتا تھا۔ میں نے ان کی سی مرتب اور منظّم علمی زندگی گزارتے ہوئے بہت کم عالموں کو دیکھا ہے جو کام ہاتھ میں لیتے اسے تکمیل تک پہنچاتے.....''

مسعود صاحب کے حیدرآباد آنے سے قبل ان کے بڑے بھائی پروفیسر امتیاز حسین خاں جامعہ عثمانیہ کے شعبہ کامرس کے پہلے صدر تھے۔ ان کی ڈالی ہوئی بنیادوں پر آج یہ شعبہ ملک بھر میں اپنی کارکردگی اعلیٰ تحقیقی کارناموں کی وجہ سے خوش نام ہے۔ جب سکندرآباد کالج او یو کو پوسٹ گریجویٹ کالج بنایا گیا تو پروفیسر امتیاز حسین خاں کو پرنسپل کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ یہیں سروس کے دوران 1966ء میں ہارٹ اٹیک ہوا اور انتقال کر گئے۔ ان کے لوح مزار کے لیے ڈاکٹر صاحب نے یک قطعہ لکھا تھا۔

وہ لختِ دل تھا مظفر کا فاطمہ کا لال
محبّ ذاکر و محبوبِ یوسف و محمود
جہانِ مہر و محبت کا اک حسینِ خیال
دلِ خدیجہ تھا وہ اور دیدۂ مسعود

جون 1962ء میں جب مسعود صاحب نے شعبہ اردو کی صدارت پر ان کے انتخاب کی خبر سنائی اور آنے کا ارادہ ظاہر کا تو امتیاز حسین خاں نے اسے اچھا نہیں سمجھا مخالفت کی۔ مگر مسعود حسین خاں صاحب کے لیے حیدرآباد کا قیام علمی و تحقیقی اعتبار سے بڑا سودمند ثابت ہوا۔ شعبہ اردو کے اندرونی خلفشار کو دور کرنے، شعبہ کی کارکردگی کو ایک علمی فضا دینے میں مسعود صاحب کا بڑا دخل رہا۔ اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر ڈی ایس ریڈی شعبہ سے خوش نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسعود صاحب جلد از جلد حیدرآباد آ کر اپنے عہدے کا جائزہ لے لیں۔ مسعود صاحب آئے میں بھرپور اعتماد اور پورے یقین کے ساتھ کہ وہ شعبے کو ایک پُر وقار شعبہ بنا دیں گے۔

بہت جلد انہوں نے اساتذہ کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ اساتذہ کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کا اندازہ ہوا تو شعبہ کے اسٹاف میں نہایت ہوشمندانہ اور مخلصانہ ردوبدل کیا۔ مناسب طریقے سے نصاب کی تقسیم کی۔ اساتذہ کو سپرد کی ہوئی ذمہ داریوں پر کڑی نظر رکھی۔ اقبال کیساتھ وجہی کی سب رس پڑھانے کی ذمہ داری خود انہوں نے لی۔ ایم اے میں میرا اختیاری مضمون اقبال تھا مگر مسعود صاحب سے دکنی کلاس سے بھی مستفید ہونے کی درخواست کی تو انہوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ دکنی زبان وادب سے میری دلچسپی کا نقطہ آغاز یہی تھا دکنی ہی کے لیے میں نے بعد میں لسانیات میں پی جی ڈپلوما بھی کیا۔

مسعود صاحب نے شعبہ میں جان ڈال دی۔ دکنی کی طرف خصوصی توجہ کی ان کا خیال تھا کہ دکنی میں جتنا تحقیقی کام ہونا چاہیے تھا اور جس معیار کا کام ہونا چاہیے تھا ابھی تک نہیں ہوسکا۔ اساتذہ کو اس میدان میں تحقیق کی طرف مائل کیا۔ پروفیسر عمر خاں روح اسلام اقبال کی نظر میں 1964ء، اقبال کا تصورِ عشق 1964ء ،اقبال کا تصور خودی 1966ء، لکھ کر شائع کروا چکے تھے۔ مسعود صاحب ہی کی وجہ سے وہ دکنی کی طرف مائل ہوئے۔ مسعود صاحب کے جاری کردہ تحقیقی رسالے قدیم اردو کی جلد اول 1965ء میں غواصی کی مینا ست ونتی مدون کر کے شامل کی جلد دوم میں عاجز کی لیلیٰ مجنوں 1967ء، کو مسعود صاحب نے شائع کیا۔ اس کے بعد غواصی سے پروفیسر عمر خاں کی دلچسپی اتنی بڑھ گئی کہ اپنے کئی اسکالرز سے انہوں نے غواصی پر ہی کام کروایا۔

مسعود صاحب ڈاکٹر حفیظ قتیل کی علمی لیاقت اور کلاسیکی ادب پر ان کی گہری نظر کے معترف تھے۔ پی ایچ ڈی میں قتیل صاحب کا مقالہ ''اردو غزل کا ارتقاء'' کے موضوع پر تھا۔ 1965ء میں ''معراج العاشقین کا مصنف'' لکھ کر خواجہ بندہ نوازؒ سے منسوب اس رسالے کو مستند دلائل کی روشنی میں ثابت کیا کہ یہ تصنیف دراصل مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی ہے۔ اس اہم تحقیقی کام سے پہلے بھی قتیل صاحب نے دیوان ہاشمی اور میراں جی خدا نما جیسے اہم موضوعات پر کام کر کے دکنی سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

پروفیسر سیدہ جعفر کا اولین تحقیقی کارنامہ ''ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ'' تھا اور ایک تصنیف اردو مضمون کا ارتقاء' ان کے تحقیقی شغف کی نشاندہی کرتا ہے مسعود صاحب کے شعبہ میں آنے کے بعد 1964ء میں انہوں من سمجھاون ترتیب دی اس کے بعد سکھ انجمن 1965ء اور دکنی رباعیاں 1966ء کی تدوین وتالیف کر کے یہ ثابت کردیا کہ مستقبل میں دکنی ادب کی تحقیق کے وہی سرخیل رہیں گی مسعود صاحب ان کی محنت، تحقیقی لگن اور قلمی فتوحات کے بہت قائل تھے۔

پروفیسر رفیعہ سلطانہ نے پروفیسر مسعود حسین خاں اور رامانج راوٴ کی تحریک پر دکنی نثر پارے، تصنیف کی، پروفیسر ثمینہ شوکت کا تحقیقی مقالہ ''مہاراجہ چندولال شاداں حیات اور شاعری'' اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے مگر انھوں نے بھی مسعود صاحب کی دکنی سے دلچسپی دیکھ کر ''شکارنامہ'' پر کام کیا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے ''دکنی ادب کی ترقی میں امین الدین علی اعلیٰ اور ان کے خلفا کا حصہ، جیسا شاندار تحقیقی کارنامہ انجام دیا۔ ڈاکٹر بدیع حسینی نے ایم اے میں بعنوان ''دکن میں ریختی کا ارتقا'' مقالہ تحریر کیا اس کے بعد میراں یعقوب کی شمائل الاتقیا پر کام کیا۔ دکنیات کی تحقیق میں ان کا یہ ایک اہم کارنامہ ہے۔ سید حمید شطاری کو قرآن مجید کے تراجم (دکنی عہد میں) کے عنوان سے پی ایچ ڈی کرنے کی ترغیب دی جو ڈاکٹر صاحب کا بہت بڑا کارنامہ سمجھا گیا۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کا اہم ترین کارنامہ ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' ہے شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ میں اپنے چھ سالہ قیام کے دوران خود انہوں نے بھی دکنی شہ پاروں

کے متون کو سائنسی انداز میں مرتب کر کے شائع کیا۔ جن میں افضل کی بکٹ کہانی 1965ء فیروز کا پرت نامہ عیسوی خاں کا قصہ مہر افروز و دلبر 1966ء کے علاوہ عبدل کا ابراہیم نامہ مرتب کیا۔ جو 1969ء میں علی گڑھ کے شعبہ لسانیات نے شائع کیا۔ اسی زمانے میں ان کے علمی لسانیاتی اور ادبی مضامین کا انتخاب، شعر و سخن، کے نام سے 1966ء میں شائع ہوا اس میں شامل مضمون بعنوان ''دکنی یا اردوئے قدیم'' میں لسانیاتی بنیادوں پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دکنی، اردو کے ارتقا کی اولین صورت ہے۔ مسعود نے یک اور اہم کام اپنے ذمہ لیا۔ انہوں نے ''دکنی اردو کی لغت'' کا پراجکٹ آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی میں داخل کیا تھا جو منظور کیا گیا اس کام میں انہوں نے پروفیسر غلام عمر خاں اور ڈاکٹر بدیع حسینی کو مددگار کی حیثیت سے شریک کیا۔ ڈاکٹر صاحب اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ''اس لغت کی تدوین میں مجھے اپنے شاگرد اور اسسٹنٹ بدیع حسینی سے کہیں زیادہ مدد ملی ہے جن کی نظر دکنی کے محاورے پر بہت اچھی تھی'' جب تک ڈاکٹر صاحب حیدرآباد میں رہے تحقیقی کے کام میں تیزی بھی آگئی اور ترفع بھی ہو گیا۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ڈاکٹر صاحب کے پاس پی ایچ ڈی کرنے والوں میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں انہوں نے رشید احمد صدیقی پر اعلی پایہ کا تحقیقی کام کیا۔ پروفیسر مغنی تبسم نے ''فانی حیات اور شاعری'' پر پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ ڈاکٹر صاحب کی نگرانی ہی میں لکھا۔ اس موقع پر فانی بدایونی کے کلام کا اسلوبیاتی مطالعہ کرنے کی تحریک مغنی صاحب کو ڈاکٹر صاحب ہی سے ملی تھی اور خود مغنی صاحب کا مزاج بھی کچھ اسی قسم کا تجزیاتی تھا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے A Phonetic and Phonological study of the words in Urdu کے عنوان سے یہ مقالہ فرانس میں اپنے قیام کے دوران 53-1950ء میں تحریر کیا تھا۔ صوتیاتی مطالعہ کی تحقیق میں مسعود صاحب پہلے ماہر لسانیات میں جنہوں نے اپنے مقالے میں اردو الفاظ کا صوتاتی اور تجزیاتی مطالعہ کیا تھا۔ پروفیسر مغنی تبسم نے صوتیاتی مطالعہ کے رجحان کو آگے بڑھایا اور لسانیات سے خاص دلچسپی لی۔

یہی نہیں پروفیسر مسعود حسین خاں نے شعبہ سے ''مجلّہ قدیم اردو'' جاری کیا تا کہ اساتذہ اور طلبا کو تحقیق کے لیے ایک تحریک ملے۔ ساتھ ہی مجلّہ عثمانیہ کا دکنی نمبر بھی ان ہی کی کاوشوں سے شائع ہوا جس کے مدیر ڈاکٹر مصطفےٰ کمال اور نائب مدیر کی حیثیت سے اشرف رفیع کو منتخب کیا گیا۔

1966ء میں پہلی مرتبہ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی میں داخلہ کے لیے انٹرنس اکزام روشناس کروایا گیا۔ شعبہ اردو سے جن اساتذہ اور طالب علموں نے اس امتحان میں شرکت کی تھی ان میں، میں بھی شامل تھی رزلٹ آیا تو شعبہ اردو میں میرا نام سرفہرست تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ مجھے وہ سپروائز کریں انہوں نے میری درخواست بخوشی منظور کی۔ اور بھی اسکالرز تھے جو یہ اعزاز حاصل کرنا چاہتے تھے کسی وجہ سے وہ ڈاکٹر صاحب کی لسٹ میں نہ آسکے۔ کسی دل جلے نہ کہہ دیا ''وہ لڑکی ہے نا اس لیے'' ہونٹوں سے نکلی تو یہ بات ڈاکٹر صاحب تک پہنچی بیمار ذہنیتوں پر اپنے تجربات کی روشنی میں ڈاکٹر حفیظ قتیل جوان کے سامنے بیٹھے تھے انہیں ایک لکچر دے دیا۔ موضوع منتخب کرنے کا مرحلہ آیا تو مجھ سے فرمایا کوئی موضوع ہو، وہ فرسٹ گریڈ کا ہو ورنہ آپ کہیں اور جا سکتی ہیں میں نے نظم طباطبائی کا ذکر کیا چونک گئے فرمایا اب تک کسی کا ذہن اس طرف کیوں نہیں گیا۔

حیدرآباد ڈاکٹر صاحب کو پسند آیا انہوں نے زو پارک کے قرب و جوار میں مکان بنانے کے لیے ایک پلاٹ بھی خریدا۔ انہیں الجھن تھی تو یہ کہ ان کی چار بیٹیوں کی شادی یہاں رہ کر کیسے کریں گے۔ ان کا خیال تھا ''حیدرآباد کے معیار کا گھوڑا جوڑا کہاں

سے آئے گا جہاں لڑکیاں شادی کے ہاٹ میں بکتی ہیں (ورود مسعود)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ لسانیات قایم ہوا تو ڈاکٹر عبدالعلیم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی نظر شعبہ کی صدارت کے لیے مسعود صاحب پر پڑی۔ مسعود صاحب شش و پنج میں تھے کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے'' والا معاملہ تھا مگر نجمہ آپا کا اصرار تھا کہ بچیوں کی خاطر علی گڑھ چلے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب حیدرآباد چھوڑ کر چلے تو گئے مگر انہیں اس کا بڑا قلق رہا۔ پروفیسر اکبر علی بیگ کو ۸/اپریل ۱۹۶۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں ''حیدرآباد چھوڑنے کا مجھے ابھی تک قلق ہے۔ خاص طور پر وہاں جیسے طالب علم لسانیات کے نئے شعبہ میں یہاں عرصہ تک نہیں مل سکیں گے لیکن جو ذاتی مجبوریاں تھیں۔ بہر حال مجھے آپ وہیں سمجھیں جہاں میرا دل اور خیال ہے''۔

پروفیسر مسعود حسین خاں وقت کے بڑے پابند تھے۔ دس بجے ٹھیک وہ کلاس میں ہوا کرتے تھے بڑی تیاری کے ساتھ کلاس لیتے تھے مجھے جب پہلی دفعہ ویمنس کالج میں پارٹ ٹائم کلاسس لینے کے آرڈر دیئے گئے تو فرمایا ''مجھے پڑھاتے ہوئے سترہ سال ہو گئے میں آج بھی کلاس میں بغیر تیاری کے نہیں جاتا آپ بھی یہی عادت بنا لیجئے'' پی ایچ ڈی کے دوران مجھے یو جی سی اسکالرشپ ملا ہوا تھا۔ جب تک ماہانہ پروگریس رپورٹ نہ دی جائے اور سپروائزر تصدیق نہ کرے اسکالرشپ نہیں ملتا تھا۔ جب تک میں کام نہ بتاؤں ڈاکٹر صاحب سرٹیفکیٹ نہیں دیتے تھے یہ ان کی ذمہ داری کا احساس تھا اور دیانت داری تھی جس کے نتیجے میں مجھے وقت پر کام کرنے کی عادت پڑ گئی۔ وقت کے بڑے پابند تھے۔ چھٹیوں میں ریسرچ کے کام سے گھر پر بلاتے تھے۔ ان کے دیئے ہوئے وقت پر پہنچنا مشکل تھا بسس کی اس زمانے میں اتنی سہولت نہیں تھی جتنی آج ہے ٹرین سے جانا پڑتا تھا اور ٹرین وقت کی پابند ہو یہ تو ممکن نہ تھا اس لیے میں اور میرے والد محترم مولوی رفیع الدین صدیقی مرحوم اول وقت ٹرین سے پہنچ جاتے تھے ان کے دیئے ہوئے وقت چھ بجے کے انتظار میں گیٹ کے باہر کھڑے ہوتے ٹھیک چھ بجے کال بل بجاتے۔ خود تشریف لاتے ایک مرتبہ تو فرمایا حیدرآبادیوں کے برخلاف آپ وقت کی پابند ہیں۔ اس وقت ڈرائنگ روم میں کوئی اور بھی ہوتا تو ان سے معذرت کر لیتے اور کہتے میں نے انہیں وقت دیا ہوا ہے بہت دور سے آتی ہیں آپ کل اسی وقت آجایئے، اکثر ڈاکٹر بدیع حسینی اور پروفیسر عمر خاں دکنی لغت کے کام سے آئے ہوئے ہوتے تھے۔ خود چائے کی کشتی اٹھا کر لاتے اپنے ہاتھوں چائے بناتے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ آپ لوگ تو چائے پکا پکا کر پینے کے عادی ہیں یہ چائے کیا پسند آئے گی۔ ہلکی سادی چائے جس میں لیمو کے چند قطرے ڈالتے تھے واقعی مزیدار چائے ہوتی تھی۔

بظاہر سنجیدہ اور بہت سنجیدہ نظر آتے تھے ان کی سنجیدہ مزاجی میں بذلہ سنجی اور ہلکی پھلکی ظرافت کا بھی عنصر شامل رہتا تھا۔

کینٹین وغیرہ کی سہولتیں اس زمانے میں نہیں تھیں حتی کہ پانی بھی پینے نہیں ملتا تھا لیڈیز روم میں جو دو صراحیاں ہوتی تھیں وہ کبھی کے خالی ہو جاتی تھیں گرمیوں میں پیاس سے بُرا حال ہوتا تھا۔ جس وقت روم میں مسعود صاحب نہیں ہوتے تھے ان کی صراحی سے پانی پی لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ تو ہم دو تین لڑکیوں نے ان کا ٹفن بھی کھا لیا۔ شعبہ کے اٹنڈر راجیا صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو بتا دیا۔ کیا ملا ہمارے ٹفن میں آپ کو دو روٹیاں ایک انڈہ اور کیا؟ آپ تینوں کا پیٹ تو نہیں بھرا ہوگا''۔ تبرک سے پیٹ نہیں بھرتا ڈاکٹر صاحب'' میں نے کہا مسکرا دیئے۔

ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں خودداری اور خود اعتمادی بلا کی تھی۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کے اکثر اساتذہ یا تو ٹرین سے

آتے تھے یا یونیورسٹی کی بس سے اپنی موٹروں سے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک ریالے سیکل خریدی اسی پر یونیورسٹی آتے اور سیکل، سیکل اسٹانڈ پر رکھ دیا کرتے تھے۔ ایک دن شعبہ کے چپراسی راجیا صاحب جو بڑے نستعلیق قسم کے آدمی تھے اور مولوی عبدالحق کا زمانہ دیکھے ہوئے تھے کہا ''حضور آپ سیکل پہ آتے ہیں اچھا نہیں معلوم ہوتا گاڑی خرید لیجئے۔ میں حاضر ہوں گاڑی چلا لیا کروں گا'' فرمایا راجیا صاحب میری چار بیٹیاں ہیں گاڑی خریدلوں گا مگر ان کے لیے دلھا نہیں خرید سکتا۔

دوپہر کا کھانا ڈاکٹر صاحب وقت پر کھاتے تھے راجیا صاحب میز پر ٹفن کھول کر رکھ دیتے پلیٹ اور گلاس دھو کر سلیقے سے لگا دیتے تھے ایک دن کھانا لگا کر بڑے ادب سے ڈاکٹر صاحب سے کہا ''حضور خاصا تیار ہے'' تعجب سے پوچھا کیا؟ ''خاصا تیار ہے'' خاصا کیا خاصا'' کھانا لگا دیا سرکار ڈاکٹر صاحب ہنسنے لگے کہا ''یوں کہونا میں حیدرآباد کا کھانا تھوڑا ہی کھاتا ہوں دو روٹیاں، دو روٹیوں کو تم خاصا کہتے ہو۔ راجیا بھی بڑا مہذب آدمی تھا پرانی تہذیب کا پروردہ کہا سرکار آپ روٹی بھی کھائیں تو وہ خاصا ہی ہے'' یہ قصہ مسعود صاحب قتیل صاحب کو سنا کر خوب ہنستے رہے۔

مذہبی اعتبار سے وہ بڑے متوازن مزاج کے تھے اقبال پڑھاتے تھے، اقبال کے مذہبی خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے ایک دن فرمایا ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم، انہوں نے ہر مذہب کو عقلیت کے معیاروں پر پرکھنے کی کوشش کی وہ مذہب کے نہیں مذہب کی فروعات کے قائل نہیں تھے۔ اسلامی اقدار کو عزیز رکھتے تھے۔ وہ اقبال کی مذہبی فکر کے بہت سے گوشوں سے متفق نہیں تھے مگر ان کے فن کی ساحری میں گرفتار ضرور تھے۔ کشمیر میں یہ زعم بھی ٹوٹ گیا۔ وادی کے ولی مخدوم صاحب کی درگاہ پر بھی حاضری دینی شروع کی لکھتے ہیں ''مخدوم صاحب کی درگاہ میں بڑی عقیدت سے جاتا دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھا رہتا'' (ورود مسعود)

مسعود صاحب کی زندگی کا ایک معیار تھا وہ معیار سادگی اور شائستگی ذہنی اور فکری پاکیزگی سے رچا بسا تھا حق گو اور حق نگر تھے پٹھانی چنگاری جو دبی رہتی تھی وہ بھی کبھی بھڑک اٹھتی تھی۔ چنانچہ ان کی خودنوشت میں کئی جگہ بے باکی اور جرأت مندانہ سچائی سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے جو لوگوں کو برا بھی لگا اور مقدمہ بھی چلا۔

جب کبھی ہمارا علی گڑھ جانا ہوتا ڈاکٹر صاحب کے دولت خانہ ''جاوید منزل'' پر حاضری ضرور دیتے تھے۔ وہ ضرور ناشتے یا لنچ پر بلاتے کہتے آپ کے استاد کا گھر حاضر ہے آپ لوگ گسٹ ہاؤز میں کیوں رہتے ہیں سیدھے یہاں آجایا کیجئے''۔

مسعود صاحب کے مضامین کی ایک طویل فہرست ہے جس میں سے ایک بھی مضمون ان کے مقررہ معیار سے کم نہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھیں عاشور نامہ 1972ء سے لے کر اردو زبان، تاریخ، تشکیل، تقدیر، ہر کتاب اپنی دستخط کے ساتھ حیدرآباد میں رہیے شاگردوں کو ضرور بھیجا کیے میرے مختصر کتب خانہ میں بھی یہ قیمتی تحفے محفوظ ہیں۔

اردو کے اساتذہ میں سے بہت ہی کم نے لسانیات کی طرف توجہ کی، غالبًا پروفیسر مسعود حسین خاں وہ پہلے استاد اردو ہیں جنہوں نے اس میدان میں قدم رکھا۔ نہ صرف قدم رکھا بلکہ یہ میدان بہ حسن وخوبی سر کیا، تحقیق، تنقید، آپ بیتی نگاری، دکنیات، لسانیات، اردو کی بقا اور ترویج کے وہ جہد کار، انہوں نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا اس میں اپنا الگ اور ارفع مقام بنایا۔ مجموعی طور پر وہ ایک جویائے اساس ذہن کے مالک تھے۔ علمی معاملات میں سطحی اور تفریحی گفتگو انہیں بالکل پسند نہیں تھی۔

مسعود صاحب شاعر بھی تھے لیکن شاعری کچھ ان کے لیے ذریعہ عزت نہیں تھی 'دو نیم' میں تمہید شعر، کا آغاز ہی اس

اعتراف کے ساتھ ہوتا ہے۔

''شعر میرے لیے ہمیشہ ذریعہ نجات رہا ہے۔ اس نے کبھی بھی مشغلے یا مشق کی صورت اختیار نہیں کی۔ یہ ہمارا فن بھی نہیں ٹھہرا''

پہلا شعر کشمیر کی تو یہ شکن سرزمین پر کہا
نہیں نہیں نہیں جاتے تم اس طرف کو مگر
قدم قدم پہ یہ لرزہ قدم کا کیسا ہے
آخری شعر بھی اسی سرزمین کا حصہ رہا
ہر گلی کوچے میں، ہر موڑ پہ وہی آہٹ
کیسا یہ شہر ہے، ہر راہ میں تم ہی تم ہو

مگر پروفیسر مسعود حسین خاں نے آخری نظم 28/جنوری 2007ء کو اپنی 88 ویں سالگرہ کے موقع پر ''سخن واپسیں'' کے عنوان سے لکھی تھی جس سے ان کی کیفیت قلبی و ذہنی کا پتہ چلتا ہے اس نظم کی ایک کاپی انہوں نے مجھے بھی بھیجی تھی۔ وہ نظم یہ ہے جن سے ان کے کرب مسلسل کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

عزیزہ، لیجیے میرا آخری تحفہ، یہ آج کل
کی رودادِ حیات ہے میں ۸۸ سال کا ہوگیا!

سخن واپسیں

دوا سے کچھ نہ ہو اور دعا سے کچھ نہ ملا
بشر نے کچھ نہ کیا اور خدا سے کچھ نہ ملا
زوال میرا مقدر بنا کے چھوڑ دیا
مجھے خیال و حدیث بقاسے کچھ نہ ملا
میں درد و داغ یتیمی میں یوں رہا محصور
پدر سے کچھ نہ ملا، مامتا سے کچھ نہ ملا
نہ غیب ہی سے ملا اور نہ زندگی سے مجھے
ندا سے کچھ بھی نہ پایا نوا سے کچھ نہ ملا
جہانِ علم و ہنر میں تو سرفراز رہا
دیارِ شوق میں میری وفا سے کچھ نہ ملا
پسر گریز پہ، دختر نفاق پر مائل
کسے بتاؤں مری التجا سے کچھ نہ ملا
میں اپنے آپ میں جھانکا تو یہ صدا آئی
خودی نے کچھ نہ دیا اور انا سے کچھ نہ ملا
پکارتا رہا انسان کے علم و دانش کو
صدا بہ صحرا ہوئی اور صدا سے کچھ نہ ملا
یہ تو نے دیدہ بینا کی روشنی لے لی
سزا، جزا کی تری اس ادا سے کچھ نہ ملا
میں خالی ہاتھ چلا آرہا ہوں تیری طرف
تجھے بتانے کو تیری عطا سے کچھ نہ ملا
ترے جہان سے خاموش چل دیا مسعودؔ
نوائے شعر کو اس بے نوا سے کچھ نہ ملا

مسعود حسین

(علی گڑھ، فروری ۲۰۰۷ء)

سب رس انٹرنیٹ پر

Sherosokhan.net پر پہلے صفحے پر اوپری جانب انگریزی سرخیوں میں ''برقی کتب'' کے عنوان پر کلک کرنے پر ''سب رس'' کے شمارے پڑھے جاسکتے ہیں۔ صفحہ اول پر ہی ایک نشان ''سب رس'' کا ہے اس پر کلک کر کے تازہ شمارہ پڑھا جاسکتا ہے۔

مضمون

راہی فدائی

سرسید کے افکار اور جنوبی ہند

جنوبی ہند کی سرزمین کئی خصوصیات کی حامل ہے۔ ان میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی معتدل آب و ہوا اور اس کی خنک فضاؤں میں ''انجذاب'' کی کیفیت نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ اسی جذب و اخذ کی صفت و صلاحیت کی فراوانی کے باعث یہاں کے اہل علم وفضل میں وسیع النظری اور اصحاب دانش وبینش میں فراخ دلی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بے انتہا فضل و احسان ہے کہ خاکِ جنوب میں صحابۂ کرام، تابعین عظام، مفسرین ومحدثین، علما وصوفیاء، اولیا واتقیا آسودہ ہیں جن کی پاکیزہ اصلاحی تعلیمات وخصوصی باطنی توجہات نے اس وسیع وعریض قطعۂ جنوب کے عالموں اور دانشوروں کو جذب و اخذ کے وقت اعتماد کے باوجود احتیاط کو مدنظر رکھنے کی تلقین کی۔ یہی وجہ ہے کہ شمالی ہند سے آنے والی ہر دینی، علمی وادبی تحریک کی خوبیوں اور بھلائیوں کو یہاں کی فضاؤں نے بطیبِ خاطر جذب کیا اور ان تحریکات کے مثبت وکارآمد پہلوؤں کو جنوب کے اکابر ومشاہیر نے اپنے اپنے حلقوں میں متعارف کرایا۔ تاریخ شاہد ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں نمو پذیر تحریکیں مثلاً علیگڈھ تحریک، ندوہ تحریک، دعوت وارشاد تحریک وغیرہ جب پہلی بار جنوبی ہند پہنچیں تو یہاں کے اہل علم نے نہ صرف ان کی پذیرائی کی اور بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا بلکہ اہل ثروت کو بھی ان کی تائید کے لئے آمادہ کیا چنانچہ ۲۷/۲۸/۲۹ دسمبر ۱۹۰۱ء کو سرسید کے زیر سرپرستی قائم شدہ محمڈن انگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کا پندرھواں سالانہ اجلاس بمقام مدراس بزیر صدارت نواب محسن الملک سید مہدی علی (متوفی ۱۹۰۷) منعقد ہوا تو اس کے دامے درمے، سخنے، قدمے تائید کرنے والوں میں ہندوستان کے اولین مدرسہ جامعہ باقیات الصالحات ویلور، تمل ناڈو (قائم شدہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء) کے بانی حضرت شمس العلماء شاہ عبدالوہاب قادری (متوفی ۱۹۱۸ء) بھی تھے جنہوں نے اپنے فرزند علامہ قاری خان بہادر ضیاء الدین محمد (متوفی ۱۹۴۱ء) تلمیذ خاص حضرت رحمت اللہ کیرانوی ورکن مجلس شوریٰ ندوۃ العلماء اور مدرسہ کے صدر المدرسین شمس العلماء حضرت علامہ شیخ عبدالجبار باقوی (متوفی ۱۹۳۴ء) کو نہ صرف اجلاس میں شرکت کے لئے روانہ فرمایا بلکہ اجلاس سے پیشتر مدرسہ کے ایک سینئر استاذ سلطان الواعظین حضرت علامہ عبدالقادر بادشاہ باقوی کو شمالی آرکاٹ کے شہروں میں مذکورہ اجلاس کے ٹکٹ فروخت کرنے کے لئے بھجوایا[1] تاکہ اس عظیم جلسے کے اخراجات کے لئے مالیہ فراہم ہوسکے۔ علاوہ ازیں اس میں حکمت عملی یہ بھی تھی کہ ٹکٹ خریدنے والے اہل ثروت کا علیگڈھ کی تعلیمی تحریک سے رابطہ استوار ہوجائے۔ غرض کہ مذکورہ دونوں بزرگ اجلاس میں شریک رہے اور بحث ومباحثہ میں دلجمعی کے ساتھ حصہ لیا جس کی تفصیل اجلاس کی مطبوعہ روئداد میں دیکھی جاسکتی ہے[2]۔

علیگڑھ کی مذکورہ کانفرنس کے بعد جنوبی ہند کے طول وعرض میں سرسید کے افکار کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں کے ذہن ودل میں انگریزی تعلیم کے حصول کا جذبہ اور جدید ونافع علوم کے اکتساب کا ولولہ پیدا ہوگیا۔ حالانکہ قطعۂ جنوب میں سرسید کی تعلیمی تحریک سے پیشتر ہی علوم جدیدہ کی تحصیل خصوصاً انگریزی تعلیم کو برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس دور میں مدراس، بنگلور، حیدرآباد شہروں میں انگریزی تعلیم یافتہ افراد موجود تھے اور ان میں تاجر وملازم پیشہ بھی تھے مگر ان کی تعداد قدرے کم تھی۔ جب سرسید کے افکار کی گونج

چاروں طرف سنائی دی تو لوگوں میں دینی تعلیم کے ساتھ دنیوی تعلیم کے حصول کا شوق سر اٹھانے لگا اور عصری علوم وفنون کو سیکھنے کا رجحان بڑھنے لگا۔ اس موقع پر یہ بات جاننا ضروری ہے کہ اس وقت شمالی ہند کے حالات کیا تھے اور اس تعلق سے سرسید کی سوچ کیا تھی؟ ان سوالات کا جواب بقول پروفیسر آل احمد سرور یہ ہے

''یہ دور ہندوستانیوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً بڑی مصیبت کا تھا۔ انگریزوں نے غدر کے بعد بڑا ظلم کیا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں عام طور پر ہراس اور سراسیمگی پھیل گئی مگر سرسید کے استقلال میں فرق نہ آیا۔ انہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ نیا سیاسی نظام اپنے ساتھ بہت سی لعنتوں کے باوجود برکتیں بھی لایا ہے اور ان برکتوں سے روگردانی کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی پستی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ قدیم نظام کی فرسودہ قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے تھے اور علوم مغربی اور جدید زندگی کی ضروریات سے غافل تھے اس لئے انہوں نے ۱۸۶۳ء میں ''التماس بخدمت ساکنانِ ہندوستان درباب ترقی تعلیم اہل ہند'' شائع کیا''۔[۳]

اسی مقصد کے تحت انگلستان سے اپنی واپسی کے بعد سرسید نے ۱۸۷۰ء میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' نکالا جس میں اپنے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے اس طرح تحریر کیا:

''اس پرچے کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز ومہذب قوم کہلائیں''۔[۴]

سرسید کے بعض عقائد اور قرآن مجید کی تفسیری تشریحات سے علماء کو اختلاف تھا جس کا اظہار انہوں نے برملا کیا مگر سرسید کو اس کی پروا نہیں تھی اور وہ اپنے متنازع آراء پر مصر بھی نہیں تھے۔ اسی لئے ۱۸۷۷ء میں ایم اے او کالج قائم کیا تو بقول پروفیسر آل احمد سرور ''سرسید نے اپنے مذہبی خیالات کو کالج کے نصاب میں جگہ نہ دی بلکہ دینیات کی تعلیم مروجہ دستور کے مطابق رکھی تاکہ ادارے کی مخالفت کم ہو۔[۵]

ٹمل ناڈو

غرض علمائے جنوب کو سرسید کے بعض دینی ترجیحات سے اختلاف کے باوجود انہوں نے سرسید کی تعلیمی تحریک کا کھل کر ساتھ دیا۔ یہ ان کی وسعت قلبی و وسیع النظری کی دلیل ہی نہیں بلکہ ان علماء کی دقت نظری، حکمت عملی اور مستقبل شناسی کا واضح ثبوت ہے۔ یہاں کے اہل علم ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہے کہ مسلمانوں کے دینی احساسات کی تازگی کے ہم دوش دنیوی افادات کی تازہ کاری بھی جاری رہے تاکہ دنیا وعقبیٰ دونوں میں ان کی کامیابی یقینی بن جائے۔ ادھر عوام الناس نے بھی اپنے خواص واکابر کی رہنمائی کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور ان کے ارشادات کی تعمیل خوش دلی سے کرتے رہے۔ یہی سبب ہے کہ تعلیمی بیداری کو عام کرنے کی خاطر سرسید کی تحریک کی توسیع کے طور پر ۷/ جمادی الآخر ۱۳۲۴ھ مطابق ۳۰/ جولائی ۱۹۰۶ء کو ام المدارس مدرسہ باقیات صالحات ویلور میں مجلس

تعلیمی اہل اسلام جنوبی ہند (South Indian Muslim Educational Committee) کا انعقاد عمل میں آیا جس میں اکیس (۲۱) تحریکیں منظور کی گئیں جس میں سے یہاں دو کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

۱) ''یہ امر نہایت ضروری ہے کہ علمائے اسلام کو انگریزی سیکھنے اور انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کو عربی میں ضروری استعداد حاصل کرنے پر آمادہ کیا جائے اور انہیں ان مقاصد کے لئے وظائف دئے جائیں۔ اس تحریر کو مولوی حکیم محمد محی الدین حسین چیدہ (متوفی ۱۳۳۶ھ) صدر مدرس مدرسہ لطیفیہ ویلور نے پیش کیا جو منظور کر لی گئی''۔

۲) ''گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ گورنمنٹ بورڈ اور منسپل اسکولوں میں جو مسلمانوں کے لئے مخصوص ہیں، مسلمانوں کو ان کے ذاتی خرچ سے دینی تعلیم دینے کے اجازت دی جائے جیسا کہ ''گورنمنٹ مدرسہ اعظم'' مدراس کے لئے دی گئی ہے۔ یہ تحریک بھی منظور کر لی گئی''۔[6]

ایس آئی ایم ای سی (S.I.M.E.C) میں منظور شدہ آراء کو روبعمل لانے کے لئے خوب جدوجہد کی گئی جس کے نتیجے میں دینی مدارس کے ساتھ عصری تعلیم گاہیں بھی قائم ہوئیں۔ ویلور ضلع میں واقع شہر وانمباڑی میں ''وانمباڑی ایجوکیشنل سوسائٹی'' کے زیر سرپرستی ۱۹۱۲ء میں ہائی اسکول کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے ٹھیک چار سال بعد مذکورہ سوسائٹی کے ذمہ داروں نے ۱۹۱۶ء میں وانمباڑی ہی میں ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' منعقد کی جس میں سرسید مرحوم کے پوتے سر راس مسعود (متوفی ۱۹۳۷ء) نے شرکت کی۔ یہ اجلاس سر اکبر حیدری (متوفی ۱۹۴۲ء) کی صدارت میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اختتام پذیر ہوا جس کا عمدہ نتیجہ ۱۹۱۹ء میں اسلامیہ کالج کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ آج اس ''اے'' گریڈ کالج میں پوسٹ گریجویٹ کورسس چل رہے ہیں اور یہ ہسٹری، کامرس، حساب اور کمسٹری میں یو۔جی۔سی سے منظور شدہ ریسرچ سنٹر کے طور پر کارکرد ہے۔

اسی طرح تاجران چرم کے مشہور شہر ''میل وشارم، ضلع ویلور ٹمل ناڈو'' میں میل وشارم مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی بزیر سرپرستی نواب سی عبدالحکیم (متوفی ۱۹۳۸ء) ۱۹۱۸ء میں وجود پذیر ہوئی جس کے تحت ۱۹۶۵ء میں سی عبدالحکیم کالج فار آرٹ اینڈ سائنس اور ۱۹۹۸ء میں انجینئرنگ کالج قائم کئے گئے جہاں تحقیقی شعبے بھی موجود ہیں۔ سرسید کی تحریک سے متاثر ہوکر مدراس کے ایک بڑے تاجر ایم جمال محمد صاحب نے ''ترچی، ٹمل ناڈو'' میں جمال محمد کالج کا سنگ بنیاد ۱۹۵۱ء میں رکھا جو آج ایک عظیم درس گاہ اور سرچشمۂ علم بنا ہوا ہے۔

چنائی (مدراس) کے بعض اہل ثروت نے مسلم ایجوکیشنل اسوسی ایشن آف ساؤتھ انڈیا کی داغ بیل ڈالی جس کے نتیجے کے طور پر ۱۹۵۱ء ہی میں ''نیو کالج'' کے نام سے عصری علوم کا ایک دارالعلوم وجود میں آیا۔ مدراس ہی کی ایک مقتدر و ممتاز شخصیت جسٹس بشیر احمد سعید (متوفی ۱۹۸۴ء) نے ''ساؤتھ انڈیا ایجوکیشنل ٹرسٹ'' بنا کر S.I.E.T College for Women کی بنیاد ۱۹۵۵ء میں رکھی جس میں آج ہزاروں طالبات زیر تعلیم ہیں۔ تاجران چرم کا مرکز و منبع کہلانے والا شہر ''آمبور'' مظاہر العلوم ڈگری کالج کے لئے مشہور ہے، اے گریڈ کا حامل یہ کالج ''آمبور مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی'' کے تحت ۱۹۶۹ء میں منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوا۔ علاوہ ازیں ٹمل ناڈو کے ساحلی شہر ''کیل کرائی''، ضلع رام ناتھ پورم میں تین صدیوں پیشتر ایک بزرگ علامہ وقت حضرت مولانا

صوفی صدقۃ اللہ اپا درس وتدریس اور دعوت واصلاح میں مشغول رہا کرتے تھے۔ آپ کے اسم گرامی کی مناسبت سے وہاں کے دولت مند افراد نے ''صدقۃ اللہ اپا ٹرسٹ'' ۱۹۷۱ء میں قائم کیا جس کے ذیل میں کئی کالجس اور ایک یونیورسٹی تشنہ گان علوم کی سیرابی کے لئے موجود ہے۔

کیرلا

سرسید کے افکار کی بازگشت ٹمل ناڈو کی پڑوسی ریاست کیرلا میں بھی سنائی دی۔ وہاں کچھ تاخیر سے سہی مسلمانوں نے عصری علوم وفنون کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ مولانا ابوصباح احمد علی ازہری نے ۱۹۴۲ء میں ''روضۃ العلوم عربک کالج'' کی شروعات کی اور انہوں نے ۱۹۴۶ء میں ایک کمیٹی تشکیل دے کر ۱۹۴۸ء میں کالی کٹ کے قریب ''فاروق کالج'' جاری کیا جسے کیرل کا علی گڑھ کہا جاتا ہے۔ بائیس (۲۲) ایکڑ زمین پر ایستادہ اس کی مختلف شاندار عمارتیں واقعتاً علی گڑھ کی یاد دلاتی ہیں، اسی لئے اس کے داخلی کمان کو وہاں کے اصحاب حل وعقد نے علی گڑھ گیٹ کا نام دے رکھا ہے۔ سرسید کے خیالات سے متاثر ڈاکٹر عبدالغفور نے ۱۹۶۴ء میں ''مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی آف کیرلا'' کی تشکیل کی۔ اس ادارے نے تمام صوبے میں عصری تعلیم کی دانش گاہوں کا جال بچھا دیا۔ ۱۹۹۴ء میں ایم ای ایس انجینئرنگ کالج اور ۲۰۰۳ء ایم ای ایس میڈیکل کالج بھی جاری کیا۔ کیرلا کی ایک اور مشہور ومعروف صاحب علم وفضل شخصیت مولانا اے پی ابوبکر احمد باقوی کانقاپورم کے نام سے متعارف ہے۔ انہوں نے دینی مدارس اور عربک کالج کے ہمدوش عصری علوم وفنون کے جامعات کے قیام میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۷۸ء میں قائم شدہ ''مرکز الثقافۃ السنیۃ'' کالی کٹ کے تحت چلنے والے ان تمام تعلیمی مراکز میں آج پچیس ہزار سے زائد طلبہ العلوم فیض یاب ہو رہے ہیں۔[۸]

کرناٹک

صوبہ کرناٹکا کی سرحدیں ٹمل ناڈو سے ملتی ہیں۔ وہاں کی تحریکوں کا اثر لامحالہ کرناٹک پر بھی رونما ہوتا ہے۔ سرسید کی علمی تحریک کے صالح اثرات کرناٹک کے جن مقتدر شخصیتوں پر ہوئیں ان میں نواب غلام احمد کلامی (۱۸۶۷-۱۹۴۷ء) کا اسم گرامی ممتاز ہے۔ آپ کے آباواجداد مدراس پریسی ڈنسی میں واقع ریاست رنجنگڈھ (نزد ترچی، ٹمل ناڈو) کے نواب تھے۔ میسور مہاراجہ کی طرف سے آپ کو ۱۹۴۱ء میں ''قائدالملک'' کا خطاب عطا ہوا۔

کرناٹک میں آپ کے علمی واصلاحی خدمات کی وجہ سے عوام وخواص میں آپ کو ''سرسید کرناٹک'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ پر سرسید کے افکار کا گہرا اثر مرتب ہوا تھا۔ آپ سرسید کے ایک عاشق صادق تھے۔ سرسید کی تحریروں نے آپ کی کایا پلٹ دی تھی جس کا اعتراف آپ نے ۱۲/اپریل ۱۹۴۲ء کو میسور کے اس عظیم الشان تہنیتی اجلاس میں کیا جو آپ کو ''قائدالملّت'' کا خطاب تفویض کئے جانے پر منعقد ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا:

> ''میری پہلی خوش قسمتی یہ تھی کہ میرے عالم شباب ہی میں باوجود میری ہر طرح کی بے بضاعتی کے مشہور آفاق سرسید احمد خان مرحوم کی تحریرات کا مطالعہ حسنِ اتفاق سے مجھے نصیب ہوا۔ ان کے اثرات میرے دل ودماغ پر اب تک حاوی ہیں اور فی الوقت یہی نیک اثرات میری اسلامیت کا باعث ہوئے۔ سرسید احمد خان کے مقالات نے ہی مجھے اکتساب علم نافع پر آمادہ کیا اور اسی شوق نے مجھے قرآن وحدیث کے مطالعہ سے بھی

مستفید ہونے پر مائل کیا''۔[9]

آپ کے انہی جذبات کی وجہ سے آپ کو ۱۹۰۱ء میں بمقام مدراس انعقاد پذیر ''آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس'' کے ایک سیشن کی صدارت کا زریں موقع فراہم ہوا اور اس کے ٹھیک بیس سال بعد ماہ مئی ۱۹۲۱ء میں آپ کی ایما پر ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' بمقام بنگلور منعقد ہوئی جس کی صدارت کے فرائض بھی آپ نے انجام دیں۔[10] آپ نے اپنے دیرینہ رفیق شفیق الملک خان بہادر محمد عباس خان (متوفی ۱۹۴۸ء) سے مل کر ''سنٹرل مسلم اسوسی ایشن'' (C.M.A) ۱۹۰۷ء میں گورنمنٹ رجسٹریشن آکٹ کے تحت قائم فرمایا جس کے زیرنگرانی آج سینکڑوں تعلیمی و رفاہی ادارے بشمول ''عباس خان ڈگری کالج فارویمن'' کامیابی کے ساتھ جاری ہیں۔ نواب کلامی کے کئی کارناموں میں سے ''یتیم خانہ اہل اسلام، معسکر بنگلور'' کا قیام ہے جس کی سرپرستی کو شہر کے اہل ثروت اپنے لئے اعزاز تصور کرتے ہیں۔ آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فیلو ''آل انڈیا مسلم کانفرنس کے رکن دوامی، انجمن حمایت اسلام لاہور، ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے رکن رکین رہے۔ آپ نے اسلامیہ کالج وانمباڑی کے قیام کے سلسلہ میں اپنے محترم دوست سابق وزیر صوبہ مدراس یعقوب حسن سیٹھ (متوفی ۱۹۴۰ء) کے ساتھ مل کر جدوجہد کی تھی۔ آپ کی عمدہ اور بے مثال کارناموں کے ثبوت کے لئے علامہ سید سلیمان ندویؒ کی درج ذیل تحریر کافی ہے جو انہوں نے سید عبدالحکیم دسنوی کو لکھی تھی اور اس کا اقتباس ماہنامہ ''معارف'' کے شمارہ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

> ''نواب غلام احمد ایک باثروت شخص ہیں لیکن قومی محبت سے ان کا دل لبریز ہے۔ قومی کاموں سے ان کو زیادہ انسیت ہے اور اس سے زیادہ دلچسپی ہے جتنی ان کو اپنے ذاتی کاموں سے ہے، قومی مصائب پر ان کا دل اسی قدر جلتا ہے جتنا ذاتی مصائب پر۔ ہر سال اپنے ہزاروں روپے قوم کے لئے نذر کرتے ہیں......[11]

نواب کلامی خان بہادر محمد عباس خان کے بعد سرسید سے متاثر ہو کر صوبہ کرناٹک میں تعلیمی انقلاب برپا کرنے والوں میں ''الامین'' تحریک کے روح رواں ڈاکٹر ممتاز احمد خان (ولادت ۶ر دسمبر ۱۹۳۵ء) کا نام نامی یقیناً ممتاز ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب کے والدین دونوں علی گڑھ کے فیض یافتہ تھے۔ والد ماجد وائی اسماعیل خان نے وکالت کی سند مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ ان پر سرسید کے اثرات نمایاں تھے۔ انہوں نے اپنے فرزند کو بھی بچپن ہی سے سرسید کے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اسی لئے ''اسٹینلے میڈیکل کالج'' سے ڈاکٹر کی سند حاصل کرنے کے باوجود آپ نے تعلیمی خدمات کو ترجیح دی۔ قوم کی زبوں حالی کا علاج عمدہ تعلیم اور صحیح تربیت میں ڈھونڈ نکالا۔ اسی غرض سے آپ نے شہر بنگلور میں ۱۹۶۶ء میں ''الامین ایجوکیشنل سوسائٹی'' رجسٹر کروائی جس کی مجلس عاملہ نے ۱۹۶۸-۱۹۶۷ء کے تعلیمی سال میں الامین آرٹس، سائنس اور کامرس کالج کی ابتداء کی جو آج اپنی پرشکوہ عمارتوں اور خوبصورت ماحول کی وجہ سے شہر میں کافی مشہور ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی سرپرستی میں نہ صرف صوبہ کرناٹک میں بلکہ ہندوستان کے دیگر صوبہ جات میں بھی الامین اسکولس، کالجس اور رہائشی انسٹی ٹیوٹس کا قیام قابل رشک و لائق تحسین ہے۔ اس تحریک کا اہم ترین کارنامہ دکن کی عادل شاہی سلطنت کے پایہ تخت ''بیجاپور'' میں ''الامین میڈیکل کالج'' کا افتتاح ہے جو ستمبر ۱۹۸۴ء میں روبہ عمل لایا گیا اور اسے ملک کے اولین مسلم میڈیکل کالج ہونے کا اعزاز

حاصل ہے۔ الامین کے بعد ۱۹۸۴ء ہی میں محترم اویسی صاحب کا ''دکن میڈیکل کالج'' حیدرآباد میں منظر عام پر آیا اور پھر ۱۹۹۹ء میں منگلور (کرناٹک) کے اینیوپویا محمد کنہی (Yenopoya Mohammed Kunhi) نے ''اینیوپویا میڈیکل کالج'' شروع کی۔ اس کے دوسرے ہی سال ''خواجہ بندہ نواز انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس'' گلبرگہ شریف میں قائم ہوئی۔ یہ تمام تعلیمی تسلسل سرسید کی تحریک کا بہترین ثمرہ ہے۔

آندھراپردیش

صوبہ آندھراپردیش ٹمل ناڈو ہی سے لگا ہوا صوبہ ہے۔ وہاں بھی سرسید کے افکار کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ آندھراپردیش کا ایک ضلع کڈپہ (Kadapa) جو تین صدیوں پیشتر سے نوابوں کا گڑھ رہا ہے، جہاں نواب عبدالنبی خان میانہ (عہد حکومت ۱۱۱۴ھ تا ۱۱۵۸ھ) نے حکومت کی تھی جس کے دربار سے ''قصیدہ بردہ'' کا اولین دکنی مترجم محمد ابن رضا وابستہ تھا، مسلمانوں کی کثیر آبادی والا یہ شہر اردو کے ماہرین اور فارسی کے کاملین کا مرکز رہا ہے، تاہم جب سرسید کی آواز کا جادو یہاں چلا تو یہاں کی منسپلٹی کے ذمہ داروں نے ''منسپل مسلم ہائی اسکول'' کے نام سے فوقانی تعلیم کا ادارہ ۱۸۸۵ء میں قائم کیا جس میں انگریزی شعبہ کے علاوہ حساب اور سائنس، انگریزی میڈیم میں اور سوشیل اسٹڈیس، تاریخ و جغرافیہ اردو میڈیم میں پڑھائے جاتے رہے ہیں۔ اب یہ اسکول منسپل کارپوریشن اردو۔انگلش ہائی اسکول بن گیا ہے۔

آندھرا کا ایک اور تاریخی مقام ضلع کرنول (Karnol) ہے جہاں کی ایک مقتدر و متحرک شخصیت ''سرسید دکن'' کے خطاب سے یاد کی جاتی ہے، وہ ہے افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق کرنولی (ولادت ۱۹۰۰ء وفات ۱۹۵۸ء) جن کے علمی خدمات کے اعتراف میں حکومت آندھراپردیش نے ''ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی'' گذشتہ سال قائم کی۔ ڈاکٹر عبدالحق کی خدمات تمام جنوب پر محیط ہیں۔ کیرلا کے فاروق کالج کے لئے آپ کی مساعی جمیلہ ناقابل فراموش ہیں۔ اسی لئے وہاں آج بھی قابل طلبا کو ڈاکٹر عبدالحق میڈل دیا جاتا ہے۔ آپ ہی کی جدوجہد کی وجہ سے مدرسہ باقیات صالحات ویلور، دارالعلوم لطیفیہ ویلور، دارالسلام عمرآباد اور جمالیہ عربک کالج مدراس کا الحاق مدراس یونیورسٹی سے ہوا اور وہاں افضل العلماء، منشی فاضل اور ادیب فاضل کا نصاب پڑھایا جانے لگا۔ آندھرا کی مشہور دانش گاہ ایس وی یونیورسٹی، تروپتی میں اردو، فارسی اور عربی کے شعبہ کا قیام ۱۹۵۹ء میں ہوا جو آپ کی خصوصی توجہات کا مرہون منت ہے۔ آپ نے ۱۹۵۳ء میں اسلامیہ عربی وطبی کالج، کرنول میں قائم فرمایا جس کا موجودہ نام ڈاکٹر عبدالحق یونانی میڈیکل کالج ہے۔ علاوہ ازیں نواب سی عبدالحکیم کالج میل وشارم اور جمال محمد کالج ترچناپلی کے قیام و انتظام میں بھی آپ کا بھرپور تعاون رہا ہے۔[۱۲]

ڈاکٹر صاحب ماہ اپریل ۱۹۵۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر بنائے گئے۔ اس منصب جلیل پر فائز رہ کر آپ نے جامعہ کے نظم و نسق میں نہ صرف سدھار اور باقاعدگی پیدا کی بلکہ وہاں کے ماحول میں بے حد خوش گوار تبدیلیاں لے آئیں۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی:

> ''کیا اپنے قول اور اپنے ظاہر سے
> اور کیا اپنے عمل اور اپنے باطن سے لڑکوں اور
> استادوں، دونوں میں ایک اسلامی انقلاب کی
> داغ بیل ڈال دی گویا وقارالملک مرحوم کا دور
> لوٹ آنے لگا اور وہاں وہ اثر چھوڑا کہ کم لوگوں
> نے اپنی اتنی اچھی اور سچی یادگار علی گڑھ میں

چھوڑی ہوگی''۔[13]

پروفیسر رشید احمد کا بیان ہے کہ:

''انہوں نے علی گڑھ والوں کے
دلوں میں اپنے لئے اتنے پاکیزہ اور قابل
احترام خیالات وجذبات پیدا کر لئے جو اتنی کم
مدت میں آج تک کوئی پیدا نہ کر سکا''۔[14]

ڈاکٹر عبدالحق کے متعلق مولانا شاہ معین الدین ندوی کی گواہی ہے کہ:

''(آپ) اب سے چند سال پیشتر
مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر بھی رہے
تھے اور اپنی قابلیت، دینداری اور حسن انتظام
سے یونیورسٹی کی فضا بدل دی''۔[15]

ڈاکٹر حق صاحب یقیناً ''جنوب کے سرسید'' کے لقب پانے کے مستحق تھے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سرسید کی روح آپ کے کارناموں پر نازاں رہی ہوگی۔ پروفیسر سید عابد حسین کا درج ذیل اعتراف ملاحظہ ہو:

''مدراس، ملبار اور آندھرا کے لوگوں
کی تعلیمی ترقی کے لئے موصوف کی ان تھک
کوششیں انہیں جنوب کے سرسید کے لقب کا
مستحق بنا چکی ہیں۔ اس کے علاوہ مسلم
یونیورسٹی علی گڑھ کی کشتی کو طوفان حوادث سے
بچا کر ساحلِ مراد تک پہنچانے میں ڈاکٹر ذاکر
حسین صاحب (وائس چانسلر) کو جو بیش
بہامدد موصوف سے ملی ہے اس نے ان کی
شہرت میں چار چاند لگا دئے''۔[16]

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے سفرنامے ''جنوبی ہند میں دو ہفتے'' میں تحریر کیا ہے:

''کرنول میں ایک کالج ہے ''عثمانیہ
کالج'' اس کا قیام مولانا عبدالحق ہی کی
کوششوں کا نتیجہ ہے۔ صرف اس کالج ہی پر کیا
موقوف ہے جنوبی ہند میں انہوں نے اس
طرح تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ
آج تک ''جنوبی ہند کے سرسید'' کے نام سے
مشہور ہیں''۔[17]

محترمہ صالحہ عابد حسین کے الفاظ ہیں کہ:

''مدراس میں ڈاکٹر عبدالحق جو
ساؤتھ کے سرسید کہلاتے تھے اور علی گڑھ میں
پرووائس چانسلر رہ چکے تھے اور جن میں
اتنا ظرف تھا کہ علی گڑھ کی وائس چانسلری کے
آفر کو رد کر دیا تھا......ساؤتھ میں ڈاکٹر عبدالحق
کی بڑی عزت تھی''۔[18]

ڈاکٹر صاحب نے ''انجمن تعلیمی مسلمانان جنوبی ہند'' کی بھی سرپرستی کی، اس انجمن کے ذریعہ آپ نے ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر علامہ اقبال کو خطبات کے لئے دعوت دی تھی۔ اس سے قبل اسی انجمن کے تحت مولانا سید سلیمان ندوی اور انگریزی مترجم قرآن ''محمد مارماڈیوک پکتھال'' کے خطبات کا بھی آپ نے اہتمام کیا تھا۔ اس طرح آپ نے سرسید کی علمی تحریک کو آگے بڑھایا اور سرسید کے افکار کی معنویت کو جلا بخشی جس سے تمام جنوبی ہند میں تعلیمی انقلاب برپا ہوا۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ سرسید کی تحریک سے سب سے زیادہ متاثر قطعہ جنوب ہوا اور سرسید کے افکار کا زیادہ فائدہ جنوبی ہند کو حاصل ہوا۔ اسی لئے آج اس کے ہر بڑی آبادی میں مسلمانوں کے اسکول کالج اور درس گاہیں موجود ہیں۔

حیدرآباد

اب آخر میں یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ملک کی آزادی سے پہلے موجود ریاستوں میں سب سے بڑی مسلم ریاست اور سلاطین آصفیہ کا پایہ تخت حیدرآباد (دکن) نے سرسید کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا؟ اور ان کے افکار کو کس طرح شرف قبولیت بخشا۔ واقعہ یہ ہے کہ سرسید نے ۱۸۷۰ء میں ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ اپنے آراء وافکار کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا جس کا خاطر خواہ اثر رونما ہوا۔ اس سے تقریباً ربع صدی پیشتر شہر حیدرآباد میں سلطنت آصفیہ کے زیر سرپرستی ۱۸۴۶ء میں نظام میڈیکل اسکول کا اجراء ہوا پھر ۱۸۵۴ء میں دارالعلوم بعد ازاں ۱۸۸۷ء میں نظام کالج، ۱۸۹۹ء میں کالج آف لا اور ۱۹۱۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی جاری کئے گئے۔ ان تعلیمی سرگرمیوں کے باوجود جب سرسید کی تحریک کی افادیت کا علم ریاست حیدرآباد کے حکمرانوں کو ہوا تو انہوں نے دل کھول کر اس کی تائید فرمائی۔ بقول ڈاکٹر داؤد اشرف:

''دراصل سرسید ۱۸۹۱ء میں جس وفد کو لے کر حیدرآباد آئے تھے اس وفد میں شبلی بھی شامل تھے۔ حیدرآباد میں سرسید اور ان کے وفد میں شریک ارکان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی تھی۔ سرسید اور وفد کے ارکان کو نواب میرمحبوب علی خان آصف سادس (عہد حکومت ۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء) نے باریابی کا موقع دیا تھا اور اس موقع پر انہوں نے علی گڑھ کی امداد کو دوگنا یعنی دو ہزار کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس دورۂ حیدرآباد کے موقع پر ایک شاندار جلسہ نواب سی وقار الامراء کی زیر صدارت بیشتر باغ میں منعقد کیا گیا تھا جس میں سرسید اور ان کے بعض رفقا کی تقریروں کے علاوہ مولانا حالیؔ نے اپنا اردو قصیدہ اور علامہ شبلی نے اپنا فارسی قصیدہ پیش کیا تھا''۔[۱۹]

اس کے بعد آصف سابع نواب میر عثمان علی خان نے صاحبزادہ آفتاب احمد خان اعزازی سکریٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی درخواست مؤرخہ ۸/جنوری ۱۹۱۶ء پر مذکورہ کانفرنس کے دفتری اخراجات اور مختلف شہروں میں کانفرنس کے انعقاد کے لئے ماہانہ پانچ سو (۵۰۰) روپئے کی خطیر رقم بطور امداد جاری کرنے کا حکم نامہ لسٹ نمبر۳، سیریل نمبر ۶۰۹ کے توسط سے دیا تھا۔ اس امداد کی اطلاع موصول ہونے پر سکریٹری موصوف نے ۸/فروری ۱۹۱۶ء کو بذریعہ ٹیلی گرام نواب صاحب کا شکریہ ادا کیا۔[۲۰]

سرسید کے افکار اور ان کی تحریک کے اثرات ریاست حیدرآباد میں اس وقت تیزی سے پھیلے جب کہ سرسید کے پوتے سیدراس مسعود ابن جسٹس سید محمود کا تقرر ۹/ستمبر ۱۹۱۶ء کو بطور ناظم محکمۂ تعلیم، ریاست حیدرآباد ہوا۔ آپ کی آمد کے صرف آٹھ ماہ بعد عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور ریاست بھر میں تعلیمی انقلاب برپا ہوا۔ اس امر واقعہ کا اعتراف کرتے ہوئے محکمہ آثار قدیمہ حیدرآباد کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر سید داؤد اشرف نے رقم کیا:

''سرراس مسعود کی اہمیت اس لئے نہیں ہے کہ وہ سرسید احمد خان کے پوتے تھے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ ایک بلند پایہ ماہر تعلیم اور علم وحکمت کا سرچشمہ تھے۔ اس سرچشمے سے ریاست حیدرآباد بھی سیراب وفیض یاب ہوئی ہے۔ سرراس مسعود نے ریاست حیدرآباد میں جو تعلیم کے شعبے میں پیچھے اور پسماندہ تھی اور جہاں خواندگی کا فیصد بہت کم تھا، علم کی روشنی پھیلانے اور تعلیم کو ترقی دینے کے لئے جو

خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں''۔[۲۱]

بہرحال سرسید کے افکار کا فیض جنوبی ہند کے طول وعرض میں خوب پھیلا اور اس سے عوام وخواص کے ہر طبقہ نے مقدور بھر استفادہ کیا۔ یہ اس لئے ہوا کہ جنوبی ہند کی آب وہوا میں کیفیت انجذاب وافر مقدار میں بفضلہ تعالیٰ پائی جاتی ہے۔

☆☆☆

ماخذ وحواشی

۱-اکبر زاہد، عکس وانمباڑی، مطبوعہ وانمباڑی اردو اکاڈمی، وانمباڑی ۲۰۱۲ء ص ۳۶

۲-روئداد کانفرنس حصہ دوم مطبوعہ آگرہ ۱۹۰۲ء ص ۳۱۸-۳۲۷

۳-آل احمد سرور پروفیسر انتخاب مضامین سرسید ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۰ء ص ۶-۷

۴-ایضاً ص ۸

۵-ایضاً ص ۱۱

۶-راہی فدائی ڈاکٹر ''مصدقات'' الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد ۲۰۱۵ء ص ۱۷۷

۷-عکس وانمباڑی ص ۳۴، ۳۹

۸-راہی فدائی ڈاکٹر قدیم ہندوستان میں علوم دین کے سرچشمے، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد ۲۰۰۹ء ص ۵۵

۹-محمد خورشید عالم ندوی 'فخر کرناٹک شخصیات' کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور ۲۰۱۲ء ص ۱۲۶

۱۰-ایضاً ص ۱۲۱

۱۱-ایضاً ص ۱۲۹

۱۲-اقبال احمد ڈاکٹر، افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق کی تعلیمی اور اردو خدمات، ڈاکٹر ایم عبدالحق ایجوکیشنل اکادمی کرنول مطبوعہ جنوری ۱۹۹۵ء ص ۱۶۷-۱۶۸

۱۳-ایضاً ص ۱۷۶، بحوالہ صدق جدید لکھنؤ، ۲۹/جنوری ۱۹۶۵ء

۱۴-ایضاً ص ۱۷۶، بحوالہ ''ہم نفسان رفتہ'' از رشید احمد صدیقی

۱۵-ایضاً ص ۱۷۹، بحوالہ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ اپریل ۱۹۵۳ء

۱۶-ایضاً ص ۳۳۲ کے بعد کور پیج پر

۱۷-ایضاً ص ۹

۱۸-ایضاً ص ۱۸۱، بحوالہ ''سفر زندگی کے لئے سوز وساز'' از صالح عابد حسین، اکتوبر ۱۹۸۲ء ص ۳۴

۱۹-داؤد اشرف سید ڈاکٹر، بیرونی ارباب کمال اور حیدرآباد، شگوفہ پبلی کیشنز حیدرآباد مطبوعہ ۲۰۰۵ء ص ۸۶

۲۰-داؤد اشرف سید ڈاکٹر، حیدرآباد کی فیض رسانی، شگوفہ پبلی کیشنز حیدرآباد مطبوعہ ۲۰۰۹ء ص ۵۱-۵۳

۲۱-بیرونی ارباب کمال اور حیدرآباد، ص ۱۵۳

قلم کاروں سے التماس

☆ برائے کرم مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔

☆ مقالہ صفحے کی ایک جانب لکھا ہوا ہو۔

☆ سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔

☆ کمپوز کیے ہوئے مسودہ کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔

☆ اپنے مضامین اور تخلیقات

"idarasabras@yahoo.in" پر بھیج سکتے ہیں۔

سب رس

میں صرف **غیر مطبوعہ** مضامین اور تخلیقات شائع ہوتے ہیں۔

عبید اللہ ہارون

مضمون

سید وحید الدین سلیم کا تنقیدی شعور

سید وحید الدین سلیم، سرسید، حالیؔ، شبلیؔ، اور نذیر احمد کے معاصر ہیں۔ وہ بیک وقت عالم، شاعر۔ سلیم کی قلم برداشتہ شاعری کا یہ حال تھا کہ انھوں نے اردو مضمون نگاری کے پرچہ کا جواب نظم میں تحریر کردیا، ممتحن نے سلیم کے جواب کو اخبار میں اس تحریر کیساتھ شائع کیا ''دنیا میں اس قابلیت کے لوگ بھی موجود ہیں کہ فاضل کے امتحان میں مضمون کے جواب میں ایسی پاکیزہ اور برجستہ نظم لکھ سکتے ہیں''۔(بحوالہ وحید الدین سلیم حیات اور ادبی خدمات،ص:17۔مضمون سراج الدین ترمذی، اردو، جنوری 29) سلیم نقاد،صحافی، مترجم، ماہر لسانیات، جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کے بانی وار دو کے پہلے پروفیسر (1919-8-28) اور ان سب میں ان کی نمایاں حیثیت مصنف ''وضع اصلاحات علمیہ کی ہے (1921ء) لفظ ''نمائندہ'' جو آج کثیر الاستعمال ہے سلیم ہی نے اس لفظ کو جدید فارسی اخبارات سے لے کر اردو میں ''علی گڑھ گزٹ'' کے ذریعہ عام کیا۔ اس تصنیف کی انفرادیت پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''ہر شخص کے لیے جو نئے خیالات کے لیے نئے الفاظ اور نئے علوم کے لیے نئی اصطلاحات بنانا چاہتا ہے اس کا بڑھنا ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوگا کہ ہماری زبان میں کس قدر وسعت، گنجائش اور لچک موجود ہے مولانا مرحوم نے ان تین سو صفحے کی کتاب میں دریا کو کوزے میں بند کردیا ہے''(اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ، مولوی عبد الحق)۔

سلیم کی تعلیم مشرقی طرز پر ہوئی، لیکن انھوں نے اپنی فکر کی شمع مغرب ہی سے روشن کی بقول مولوی عبدالحق ''مغربی علوم کا جو منشاء ہے اس سے ایسے واقف تھے کہ بہت کم جدید تعلیم یافتہ لوگ واقف ہوں گے''۔(چند ہم عصر، مولوی عبدالحق،ص:123) سلیم کو اردو تنقید میں وہ مقام حاصل نہیں ہوا جو حالیؔ اور شبلیؔ کو ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ انھوں نے تنقید پر کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی۔ صرف چند تنقیدی مضامین جو انھوں نے وقتاً فوقتاً تحریر فرمائے اور جسے بعد میں ''افادات سلیم'' کے نام سے شائع کردیا گیا۔ اس کے باوجود اردو تنقید کے باب میں سلیم کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ وہ آزادؔ، حالیؔ اور شبلیؔ کے بعد ایسے ناقد کی حیثیت سے ابھرے ہیں جن کی حیثیت ''پُل'' کی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''.......آزادؔ و حالیؔ اور شبلیؔ کے دور کے بعد.... درمیانی عرصہ میں تین ایسے نقاد ابھرے ہیں جن کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ وہ ''پل'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی وحید الدین سلیم، امداد امام آثرؔ اور مہدی افادیؔ''۔ (تنقید اور جدید اردو تنقید، وزیر آغا،ص:178) سلیم کے انہی تنقیدی مضامین کی روشنی میں ان کا تنقیدی شعور زیر بحث ہے۔

وحید الدین سلیم، سرسید اور حالیؔ سے متأثر ہیں وہ ادب میں افادیت کے قائل ہیں۔ اور ادب کو اخلاقی وسماجی ضرورت کے لیے استعمال کرنے کو نامناسب نہیں سمجھتے ہیں۔ سلیم نے اپنے تنقیدی موقف پر کہیں کچھ واضح طور پر تحریر نہیں فرمایا، البتہ ان کے تنقیدی مضامین سے ان کے نظریہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عرب کی شاعری سے متأثر، ہیں جیسا کہ وہ شاعری میں شاعر کی شخصیت، اس کے

ماحول، سماجی، تہذیبی، ملکی، جغرافیائی، تاریخی وتمدنی خصوصیات کی جھلک کے قائل ہیں۔ سلیم چونکہ عربی زبان سے بحسن وخوبی واقف تھے ان کی عربی دانی اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ان کے ''تلمیحات'' سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس لیے وہ عربی کے اس مقولہ کو اپنی اتمام حجت کے لیے پیش کرتے ہیں۔ جس میں عرب کی شاعری کو عرب کا دفتر کہا گیا ہے۔ سلیم لکھتے ہیں:

''الشعر دیوان العرب، یعنی عرب کی شاعری عرب کا دفتر ہے، دفتر کے لفظ سے یہ مراد ہے کہ اس میں عرب کا جغرافیہ، عرب کی تاریخ، عرب کا تمدن، عرب کا طریقۂ معاشرت، عرب کے خیالات وتوہمات، عرب کی قومی وملکی خصوصیات سب کچھ ہے۔ اگر کوئی شخص عرب کی شاعری کا مطالعہ کرلے تو کوئی بات عرب یا اہل عرب کے متعلق ایسی نہیں ہے جو اس میں نہ مل سکے۔ عرب کی شاعری کو اس نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں'' (افادات سلیم، وحیدالدین سلیم، عرب کی شاعری، ص:212) اس عبارت مذکورہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلیم عربی شعرا کے کلام میں جن چیزوں کی روایت کو دیکھتے ہیں وہ ان چیزوں کو اردو شاعری میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔

سلیم یورپ کی شاعری کی کورانہ تقلید کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یورپ میں شاعر کے نزدیک خیال قافیہ پر مقدم ہے اور اردو شعرا کے نزدیک قافیہ خیال پر مقدم ہے اس وجہ سے ''یورپ کے شعرا کی نفسیات ہمارے شعرا کے نفسیات سے جدا گانہ ہیں'' (افادات سلیم، ہمارے شاعروں کی نفسیات، ص:210) وہ اردو شاعری کو بیرونی واندرونی خصوصیات میں تقسیم کرتے ہیں۔ زبان وبیان، اسلوب اور ہیئت کے معاملے میں ان کا موقف عربی و فارسی سے ملتا ہے۔ ''افادات سلیم'' میں ان کا ایک مضمون ''اردو شاعری کا مطالعہ'' کے عنوان سے ہے اس میں سلیم کلام کے خارجی و داخلی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے اپنے تنقیدی شعور کا اظہار یوں کرتے ہیں: ''سب سے پہلے آپ کو شاعر کے کلام کا بیرونی مطالعہ کرنا چاہیے، یعنی یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کلام کی ظاہری ساخت کیسی ہے؟ اس کی شکل کس قسم کی ہے؟ آپ اس کے لفظی تار پود، نحوی تراکیب، عروضی وبیانی خصوصیات پر نظر ڈالیں، اس کے بعد آپ اس کلام کا اندرونی مطالعہ کریں، یعنی یہ دیکھیں کہ وہ کلام کس قسم کے خیالات پر حاوی ہے۔ شاعر کن کن خاص معانی کا بار بار اعادہ کرتا ہے؟ اور وہ اکثر کن خاص افکار کے دائرے کے اندر گھومتا ہے'' (افادات سلیم، اردو شاعری کا مطالعہ، 182)۔

وحیدالدین سلیم کا خیال ہے کہ شاعری محض قافیہ پیمائی کا نام نہیں ہے۔ وہ غزل کی شاعری کو اس وجہ سے ناپسند کرتے ہیں کہ اس میں شاعر قافیہ ہی کے سہارے آگے بڑھتا ہے اور اپنی ذاتی آرا اور ذہنی کیفیات کی طرف رخ نہیں کرتا ہے۔ سلیم اپنے نظریہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

''یہ شاعری نہیں بلکہ قافیہ پیمائی ہے۔ شاعر کسی فوری خیال یا اپنی کسی ذہنی کیفیت کو بیان کرنا نہیں چاہتا، بلکہ ہر قافیہ جس خیال کے اظہار پر مجبور کرتا ہے بے پروائی سے اس کو باندھ جاتا ہے'' (افادات سلیم، ہمارے شاعروں کی نفسیات:209)

سلیم شاعری اور زندگی میں تطابق کے قائل ہیں۔ وہ اس چیز کو بڑی اہمیت دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ شاعر کا کلام ان کی زندگی کا آئینہ ہونا چاہیے۔ سلیم نے میؔر کی شاعری پر نقد کرتے ہوئے میؔر کے کلام کو ان کی زندگی کا آئینہ کہا ہے سلیم رقم طراز ہیں:

''ایشیا کے شاعر بدنام ہیں کہ ان کا کلام اور ان کی زندگی دونوں مطابق نہیں ہیں مگر یہ مقولہ کہ شاعر کا کلام اس کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے جتنا میؔر پر صادق آتا ہے شاید ہی کسی اور شاعر پر صادق آئے' (افادات سلیم، میر کی شاعری، ص:72)

وحید الدین سلیم شاعری میں متضاد خیالات کے اظہار کی

اجازت نہیں دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ سچا شاعر وہ ہوتا ہے جس کے بیانات میں اختلاف نہ ہوں ورنہ ان کی شاعری مصنوعی اور غیر حقیقی تصور کی جائے گی اور شاعر کی حیثیت محض نقال کی رہ جائے گی۔ سلیم یہاں پر بھی افادی اور اخلاقی پہلو کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

''یہ کیونکر ممکن ہے کہ شاعر ایک لمحہ میں ایک ہی چیز کو ترغیب دلا کر دوسرے لمحہ میں اس سے نفرت دلائے۔ یہ انسان کی طبعی نفسیات کے خلاف ہے... شاعر کے اختلاف بیان اور تناقض خیالات سے اس کا بے ساختہ پن ظاہر نہیں ہوتا اور نہ یہ بات شاعری کو زیور ہے، بلکہ اس سے صداقت شعری پر حرف آتا ہے اور اس کے دل کی اصلی کیفیت کا اظہار نہیں ہوتا، بلکہ اس کی شاعری کے مصنوعی اور غیر حقیقی ہونے کی خبر دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ شاعر فقط نقال ہے''(افادات سلیم، ہمارے شاعروں کی نفسیات، ص:209-208)

سلیم اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ شاعر اپنی پوری توجہ زبان دانی اور الفاظ کے گورکھ دھندے میں صرف کرے ایسے شاعر کو وہ شاعر کہلانے کا مستحق نہیں سمجھتے ہیں سلیم کا یہ نظریہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ الفاظ کے بجائے معانی کی طرف ان کا رجحان زیادہ ہے

وحیدالدین سلیم شاعری میں قوت تخیل کو اہمیت دیتے ہیں، وہ اپنے تنقیدی مضامین میں مختلف مقامات پر اس طرف اشارہ بھی کرتے ہیں۔ سلیم سودا کی ہجویہ نظموں پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس طرح بخیل کی ہجو میں سودا نے تخیل کی قوت سے کام لے کر مذمت کے نئے نئے پہلو نکالے ہیں اسی طرح میر ضاحک کی ہجو میں اپنی قوت متخیلہ کا کمال دکھایا ہے''(افادات سلیم، سودا کی ہجویہ نظمیں، ص:55) قابل التفات بات یہ ہے کہ سلیم قوت تخیل سے کیا مراد لیتے ہیں؟ اور کن کن مقامات پر اس کے استعمال کو ضروری سمجھتے ہیں؟۔ اس پر انھوں نے کوئی واضح بحث نہیں کی۔ یقیناً سلیم کا یہ پہلو یہاں تشنہ طلب ہے۔

سلیم نے ''سودا کی ہجویہ نظمیں'' کے عنوان سے جو مضمون تحریر فرمایا ہے ان سے سلیم کی نفسیاتی رجحان کا بھی پتا چلتا ہے۔ انھوں نے بعض مقامات پر شعوری طور پر ادیب کی نفسیات سے بحث کی ہے اور یہ چیز حالی اور شبلی کے یہاں نہیں پائی جاتی ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہجویات نفسیاتی مطالعہ کا ایک دلچسپ باب ہے اس میں شاعر کی نفسیات، اس کی ذہنی کیفیات اور اس کے اندر پوشیدہ شخص زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ سلیم نے اس کا مطالعہ گیرائی و گہرائی سے کیا کہ ہجو لکھنے کے کیا کیا اسباب و علل ہو سکتے ہیں؟ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''ہجو و مذمت کے نفسیاتی محرکات بہت سے ہیں مگر حسب ذیل محرکات زیادہ اہم ہیں: حسد، حد سے زیادہ کنجوسی، حد سے زیادہ حرص، مذہبی اختلافات، اظہار فخر، ریا اور نفاق، جوش انتقام، ایذا رسانی''(افادات سلیم، سودا کی ہجویہ نظمیں، ص: 44) ذکر کردہ محرکات میں نفسیاتی مطالعہ کے لحاظ سے حسد، اظہار فخر اور ایذا رسانی زیادہ اہم ہیں۔

وحیدالدین سلیم کی عملی تنقید کے نمونے ''سودا کی ہجویہ نظمیں''، ''میر کی شاعری'' اور ''دکن کے ایک رباعی گو شاعر'' میں ملتے، جہاں تک رہی بات ''سودا کی ہجویہ نظمیں'' کی اس میں تنقید سے کہیں زیادہ سودا کی ہجویہ نظموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے، البتہ بعض مقام پر ہجویات کے تنقیدی جائزے کے ساتھ اپنے تنقیدی شعور کا بھی ثبوت پیش کیا ہے جیسے کہ ''ہمارے شاعروں کی نفسیات'' کے عنوان سے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''شاعر بھی ایک انسان ہے اس کے دل میں بھی وہی جذبات ہیں جو تمام انسانوں کے دل میں ہیں، جب کوئی ایسا محرک اس کی طبیعت میں پیدا ہوتا ہے تو وہ بھی اپنی زبان و قلم سے کام لیتا ہے'' (افادات سلیم ،سودا کی ہجویہ نظمیں ،ص:45) سلیم ان ہی اصول و نظریات کی روشنی میں سودا کے ہجویات پر نگاہ ڈالتے ہیں جو ان کے تنقیدی شعور پر دال ہے۔

من حیث المجموع وحید الدین سلیم کے ان مختصر مضامین (افادات سلیم) سے ان کے تنقیدی شعور کے جو اشارات ملتے ہیں اس کی اہمیت ہماری تنقید کی تاریخ میں ناقابل فراموش ہے، کیونکہ ان سے تنقیدی نظریات کے ارتقا کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے اور یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ اردو تنقید میں آغاز سے ہی نفسیاتی رجحان پایا جاتا ہے، لیکن واضح طور پر اس پر زیادہ زور سب سے پہلے وحید الدین سلیم ہی نے دیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا اطلاق ادب اور تنقید میں مفصل اور منظّم شکل میں مرزا رسوا نے کیا جن کی طرف ان کے معاصرین میں حالی یا شبلی کسی نے اس انداز سے نظر التفات نہیں کی جس کا تفصیلی ذکر ''مرزا رسوا کی تنقیدی مراسلات''، مرتب: محمد حسن میں کیا گیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔

☆☆☆

بیگ احساس

کا

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ

افسانوں کا مجموعہ

دَخمہ

قیمت: -/200 روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵

مضمون

عائشہ شاہین

جستجو کیا ہے

انتظار حسین اردو کے ممتاز فکشن رائٹر ہیں جن کے افسانے اور ناول اپنی علامتی معنویت اور تہ دار اسلوب اور موضوعات کی انفرادیت کے سبب اردو میں اہم مقام رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے فکشن نے جو نقش قائم کیا وہ ان کی گزری یادوں کے پس منظر اور دیومالائی عناصر کی شمولیت کے سبب ہوا، اور عموماً ان کے افسانوں کو ان کی تہذیبی شخصیت کے زوال اور ہجرت کے شدید احساس کے زیر اثر سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ یہی رویہ غالباً ان کے افسانوں کو دوسرے افسانہ نگاروں سے الگ کرتا ہے۔لہذا ان کی کتاب 'جستجو کیا ہے' کو بھی ان کی تہذیبی، ثقافتی و دیومالائی عناصر کی شمولیت اور ہجرت کے شدید احساس کے سبب اسی سلسلے کی ایک کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔

جستجو کیا ہے' کے مطالعہ سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ کتاب کس صنف کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔انتظار حسین نے خود بھی اس کتاب کو کسی صنفی حد بندی میں مقید نہیں کیا ہے بلکہ اس کتاب کو کسی صنف کا پابند بنا کر لکھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہاں یہ بات زیادہ اہم نہیں کہ ان کے نزدیک خودنوشت یا سفرنامے کی صنفی تعریف کیا ہے یا مصنف اس کتاب کو کسی خاص صنف کا نام دے کر اپنی ذمہ داری سے عہد برا ہوا یا نہیں۔خودنوشت سوانح صنفی اعتبار سے مصنف کی گزری ہوئی زندگی کی داستان ہے، جس کا سب سے اہم محرک اظہار ذات ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اظہار ذات کے لئے خودنوشت جیسی صنف کو فروغ ملا۔ مگر اظہار ذات کے عناصر ادب کی دوسری اصناف مثلاً سفرنامہ، خطوط، رپورتاژ وغیرہ میں بھی پائے جا سکتے ہیں جس کا سبب یہ کہ ان اصناف کا تعلق خود لکھنے والے کی ذات سے ہے۔اس اعتبار سے خودنوشت اظہار ذات کے سبب جہاں صنفی اعتبار سے غیر افسانوی اصناف سفرنامہ، خطوط اور رپورتاژ سے خاصی قریب معلوم ہوتی ہے وہیں تاریخ نگاری کی پابند نہ ہونے کے سبب افسانوی ادب میں ناول جیسی صنف سے قریب معلوم ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خودنوشت سوانح نگاری کے لئے اگرچہ تاریخ کی قید لگائی جاتی ہے مگر مصنف یادوں کی بنا پر اپنی سوانح قلم بند کرنے کے سبب تاریخ سے نسبتاً آزاد نظر آتا ہے۔انتظار حسین کی کتاب 'جستجو کیا ہے' ان کی زندگی کے حقیقی واقعات پر مبنی ہے، مگر ان کا ناول ''بستی'' بھی ماضی کی یاد اور مرکزی کردار کی ہجرت کے شدید تجربہ اور واقعات کے بیان پر مبنی ہے جس کو ہم 'ناول' کا نام دیتے ہیں۔مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اس ناول میں بیان کئے گئے واقعات پر حقیقت کا محض گمان ہوتا ہے جب کہ 'جستجو کیا ہے' میں بیان کئے ہوئے تمام واقعات و کردار حقیقی ہیں جن کو بیان کرنے والا خود مصنف ہے۔اس کے علاوہ ناول میں انتظار حسین نے واقعات کے بیان کے علاوہ کردار کی تخلیق، پلاٹ، بیانیہ اور کرداروں کی ان تمام ذہنی و نفسیاتی حقائق اور سماجی پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ہے جس سے قاری کا ذہن متاثر ہوتا ہے اور اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔یہ وہ عناصر ہیں جن سے عہد برا ہونا ناول نگار کے لئے ضروری ہے اور جن سے غیر افسانوی اصناف نسبتاً آزاد ہیں۔

انتظار حسین اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تو میں لکھتا چلا گیا یہ سوچے بغیر کہ کونسی صنف ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔اب جب کہ میں لکھ چکا ہوں تو بھی میں اسے کسی خانے میں مقید کرنے کی کوشش کو روا نہیں سمجھتا اس سے قاری کو شہ ملے گی اور وہ اپنے طور پر طے کرنے کی کوشش کرے گا۔ممکن

ہے وہ اسے خودنوشت جان کر پڑھنے کی کوشش کرے اور پھر سوال اٹھائے کہ یہاں خودنوشت کے تقاضے پورے ہوئے ہیں یا نہیں مگر ممکن ہے کوئی اور پڑھنے والا اس سے اختلاف کرے اور کہے کہ یہ تو بس سفرنامہ ہے۔'' (حوالہ: کتاب، جستجو کیا ہے، انتظار حسین، صفحہ نمبر۔۲۹۴، سن اشاعت، ۲۰۱۲، ایجوکیشنل بک ہاوس، دہلی)

'جستجو کیا ہے' انتظار حسین کی زندگی اور ذات کے اظہار پر مبنی ایک اہم کتاب ہے جس میں ان کی زندگی سے وابستہ تمام حقیقی واقعات قلم بند کئے گئے ہیں۔ مگر انہوں نے اس کتاب کو نہ تو محض تاریخ کا پابند بنا کر پیش کیا ہے جیسا کے عام طور پر خودنوشت میں ہوتا ہے اور نہ ہی ناول جیسی صنف کی طرح کردار اور پلاٹ کے تقاضوں کو پورا کیا ہے اور نہ ہی سفرنامے جیسی صنف کا پابند بنا کر حال سے وابستہ محض وقتی بیان پر انحصار کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہذا مصنف نے ان تمام صنفی حد بندیوں کو قبول نہ کرنے کے باوجود واقعات کو غیر حقیقی اور غیر تاریخی بنا کر پیش نہیں کیا ہے، بلکہ اس کتا ب کو پڑھ کر سب سے پہلا تاثر یہی پیدا ہوتا ہے کہ مصنف نے ان تمام اصناف کے مثبت پہلوؤں کو روبہ عمل لاتے ہوئے اپنے وطن اور ماضی کی یاد اور وطن سے وابستہ مختلف واقعات کو پیش کیا ہے۔ خودنوشت کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خود اپنے قلم سے اپنی زندگی اور اپنی ذات کو بے نقاب کرنا آسان کام نہیں جس کا سبب یہ ہے خودنوشت خود اپنے قلم سے لکھنے کا فن ہے جس میں خود ستائی اور خودشناسی کے عناصر کے شامل ہوجانے کا امکان ہے۔ مگر انتظار حسین نے اپنی ذات کے اظہار کے لئے سفرنامے جیسی صنف کا انتخاب کیا جس کے سبب ان کی خودنوشت سے وابستہ تمام عناصر ان کے سفر ہی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں اور ان کی ذات ان کے خاندان، آباؤاجداد اور ان سے وابستہ تمام واقعات و یادوں اور تاثرات کا بیان سفر کے دوران ظاہر ہونے والا جذباتی اور ذہنی ردِّعمل۔ لہذا انہوں نے اپنی داستان حیات کو شعوری طور پر براہِ راست بیان کرنے کے بجائے اس کو سفرنامے کا حصہ بنا کر پیش کیا جس میں ماضی کے واقعات ہندوستان کے سفر کے دوران فطری طور پر بیان ہوتے چلے جاتے ہیں۔

''جستجو کیا ہے'' دراصل ان کے ہندوستان کے سفر کی داستان ہے اور مختلف مقامات سے وابستہ تجربات، واقعات، مشاہدات اور یادوں کا بیان بھی۔ ہندوستان میں جن مقامات پر ان کا سفر ہوا خواہ وہ ان کا وطن ڈبائی ہو یا دوسرے مقامات ان کے لاشعوری پس منظر کو ضرور سامنے لے آتا ہے جس میں ان کا پورا ماضی اور ان کی روایت پوشیدہ ہے۔ انتظار حسین خود بھی ایک ناول اور افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور رہے۔ جس طرح ان کے افسانوں میں ماضی کی یادوں اور واقعات کو پیش کرنے کی کوشش میں ناسٹیلجیا کا عکس نظر آتا ہے اسی طرح ان کا سفرنامہ بھی ماضی کے واقعات، وطن کی محبت اور اس کی یادوں کو بیان کرنے کے سبب ناسٹیلجیا پر مبنی ہے۔ مگر ان کے افسانوں میں ماضی کے واقعات کسی حد تک غیر حقیقی اور تجریدی سطح پر نمودار ہوتے ہیں، جو ان کی اس کتاب میں زیادہ حقیقت پسند اور واقعی معلوم ہوتے ہیں۔ لہذا اس کتاب میں اظہارِ بیان کے دو رویہ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ انتظار حسین جہاں اپنے سفر کے مشاہدات اور تجربات کو بیان کرتے ہیں وہاں ان کی شخصیت کا خارجی پہلو زیادہ نمایاں ہے، دوسرے یہ کہ ماضی کے واقعات اور ان سے وابستہ جذبات اور احساسات کا بیان ان کے داخلی ردِعمل کو سامنے لے آتا ہے جو ان کے ذہنی اور جذباتی کرب کو ظاہر کرتا ہے۔ ماضی کے بیان میں ان کے داخلی کرب کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

''ارے یہ تو در و دیوار ہی اور ہیں، نہ یہاں چامنڈا نظر آرہی ہے نہ ہماری وہ کربلا جس کی بغل میں املی کے پیڑوں پہ بندر جھولتے رہتے تھے۔ نہ گنگا کی وہ پتلی دھار جو چھوئیے کے

نام سے بہتی تھی۔نہ سنبھل والوں کی چوپال نہ مالا گڑھیا کا امام باڑا۔اتنے کہاں گم ہو گئے کھڑکی والے گھر کا عزاخانہ کہاں گم ہو گیااور یہ کھڑکی بازار کہاں گم ہوگیا۔'' (صفحہ نمبر۔۵۶)

دوسرا اقتباس:

''عجب خواب تھے۔تھے نہیں بلکہ تھا۔وہ ایک خواب تھا کہ بھیس بدل بدل کر میرے خوابوں میں آرہا تھا،سمجھنا چاہو تو یوں سمجھو کہ ان خوابوں نے اس خواب نے ان دنوں میں جا کر رنگ پکڑا جب میں لاہور میں رچ بس گیا اور چھوڑی ہوئی بستی ایک خواب وخیال بن گئی۔'' (صفحہ نمبر۔۱۷)

انتظار حسین کے سفرنامے میں ان کا داخلی وجود خارجی وجود سے متصادم دکھائی دیتا ہے مگر اکثر داخلی وجود ان کے ظاہری رویوں پر حاوی نظر آتا ہے۔گویا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ واقعاتی دنیا سے زیادہ داخلی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جس پر ان کے ماضی کے گہرے سائے ہیں۔اس کا اندازہ اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب وہ ماضی کے واقعات کے ساتھ ان سے وابستہ ذاتی تاثرات بیان کرتے ہیں۔اس سلسلے میں ان کے بیان کردہ خارجی واقعات بھی ان کے داخلی وجود کے اظہار کا بہترین وسیلہ بن جاتے ہیں۔لہذا ان کا یہ بیان اس سلسلے میں اہم ہے جہاں خارجی واقعات سے زیادہ ان کا جذباتی تاثر اور داخلی ردّعمل زیادہ اہم ہوجاتا ہے:

''دراصل میں اور منیر نیازی جنت سے ایک ہی وقت نکالے گئے ہم نے ایک دوسرے کو کو اسی حیثیت سے پہچانا۔منیر نیازی سنانے لگتا کی اس کی بستی میں آموں کے کیسے گھنے پیڑ تھے۔میں بیان کرنے لگتا ہوں کہ اپنی بستی میں شام کیسے پڑتی ہے اور مور کس رنگ میں بولتا ہے منیر ہمیشہ سنایا اور سنا جیسے وہ یہ داستان پہلی مرتبہ سنا رہا ہے اور پہلی مرتبہ سن رہا ہے۔۔ہم اپنی اپنی گمشدہ جنت اپنے دھیان میں بسائے پھرتے ہیں۔۔مگر ہمارا حافظہ ہمارا دشمن بن گیا۔حافظے نے بی بی حوّا کو بھی بہت پریشان کیا تھا،جنت سے نکلنے بعد انہیں جنت ایک عمر تک یاد آئی۔۔، جب منیر اپنے جون پور کو پکارتا ہے تو میرا بھی ایک بستی کو پکارنے کو جی چاہتا ہے۔'' (صفحہ نمبر ۲۷۷)

انتظار حسین کی ذات جس کرب کا شکار نظر آتی ہے وہ ان کی ہجرت اپنے ملک بستی اور ایک تہذیب کے ختم ہو جانے کا کرب ہے۔اگرچہ انتظار حسین کے افسانے اس تہذیبی زوال اور اس کے کرب کا شدید اظہار ہیں مگر ان کا سفرنامہ ہندوستان کی مٹتی تہذیب کا نوحہ نہیں بلکہ اس کی گمشدہ کڑیوں کی تلاش ہے جو ان کے لاشعور کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔لہذا ان کے سفر کے دوران پیدا ہونے والی ابتدائی یادیں جو ان کے ذہنی اور جذباتی ردّعمل کا نتیجہ ہیں ان کی مشترک تہذیبی اور ثقافتی وابستگی کو ظاہر کرتی ہیں،اور ان کا یہ تہذیبی وثقافتی یا مٹتی ہوئی تہذیب کا بیان محض ایک تاریخی واقعہ ہی نہیں بلکہ تہذیبی بازیافت کا رول بھی ادا کرتا ہے۔اپنے محلّہ اور گھر کے آس پاس کی تہذیبی فضا کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ ہندو مسلم تہذیب کے اتحاد کا ایک نقش سامنے آجاتا ہے۔لکھتے ہیں:

'' تو اس گھر کی آب وہوا اسلامی تھی مگر ارد گرد کی ہوا ہندوانی تھی۔کیا خوب گھر تھا۔چار قدم آگے بڑھو تو مندر کھڑا نظر آتا ہے۔چھ قدم پیچھے جاؤ تو اپنی مسجد میں پہنچ جاتے تھے۔تو میں مندر اور مسجد کے بیچ اپنی چھت پر اس آزادی سے کٹی ہوئی پتنگوں کے پیچھے دوڑتا تھا کہ برابر میں پھیلی ہندو چھتوں کو بھی اپنی ہی چھت میں شمار کر لیتا تھا۔۔۔۔گھر کے اس محل وقوع میں یہ فائدہ پہنچا کہ ہولی اور دیوالی کے تیوہار اپنے تیوہار لگنے لگتے۔''

اس کتاب میں مصنف کا خاندان،معاشرہ،تہذیب وثقافت کا بیان ہر جگہ مصنف کی دلچسپی کو ظاہر کرتا ہے۔لہذا ڈبائی،علی گڑھ،لکھنو،کلکتہ،برندابن اور بنارس جیسے مقامات کے سفر

میں ان کا بنیادی سروکار ان کی تہذیبی ،ثقافتی اور دیومالائی عناصر کے ساتھ وہاں کے تاریخی پس منظر کو بھی پیش کرنا ہے جس کے سبب یہ تمام عناصر اور بعض تاریخی واقعات و کردار کافی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں ۔مگر زیادہ سروکار ان مقامات سے وابستہ بعض مادّی اقدار کے بیان سے رکھا ہے جو ہندوستان کی قدیم تہذیب کی نمایندگی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں ۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے وطن بدایوں،کلکتہ،لکھنؤ ،دہلی اور برندابن کی بعض مذہبی عمارات اور مزاروں کا بیان اور اس کے باغوں ،مندروں اور ان سے وابستہ قدیم رسوم و رواج کا ذکر بڑی دلچسپی سے کیا ہے ۔اس کا اندازہ ہندوستان کے مشہور شہر برندابن کے بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو ہندووں کا مذہبی مرکز ہے ۔لکھتے ہیں:

''مورتی تو بعد کی بات ہے میں نے کہا' یہ مندر تو مجھے مندر ہی نظر نہیں آ رہا' جی ہاں اس کا طرز تعمیر مختلف ہے ۔یہاں اسلامی اورہندو طرز تعمیر کا امتزاج ہے۔کہہ لیجئے کہ یہ مندر گنگا جمنی تہذیب کا مظہر ہے ۔'' صفحہ نمبر۔۱۶۵

''یہ بندرابن کی کنج گلی تھی مگر یہ کوئی ایک گلی تھوڑا ہی تھی۔۔۔لیجئے ہم نے ان کا آشرم ڈھونڈھ نکالا۔خوب جگہ ہے۔کیسے صاف ستھرے دھلے منجھے کمرے ہمیں ملے۔میں ان سے پہلا سوال کیا سوامی جی معاف کیجئے بندرابن نے مجھے اچنبھے میں ڈال دیا۔یہاں رادھا ہی رادھا نظر آ رہی ہے۔کرشن جی تو کہیں نظر ہی نہیں آ رہے۔جیسے بس رادھا جی کا ہی راج ہو'' صفحہ نمبر۔۱۶۲ اس کے علاوہ وطن ڈبائی کی مذہبی رسوم و رواج اور اپنے عقائد و اعمال کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں:

''اور ہاں شب برات کا حلوہ۔حلوے اور روٹی پر مردوں کی فاتحہ مگر تخصیص کے ساتھ حلوہ کیوں۔ہماری ایّا اماں نے بتایا کہ حضور ﷺ پاک کی مبارک دانت شہید ہو گیا تھا تو بی بی فاطمہ نے ان کے لئے حلوہ پکایا۔سو یوں تھا کہ شب برات کا حلوہ تو سنّت تھا سو اب کس ذوق وشوق سے یہ مبارک حلوے تیار کئے جاتے ہیں ۔نیاز دلاتے ہیں بانٹتے ہیں اور خود کھاتے ہیں۔۔۔۔اب جن جن کی مرادیں ہیں وہ پوریاں پکار ہے ہیں اور امام کی نیاز دلا رہے ہیں۔نیاز کی پوریاں شام تک ختم ہو جانی چاہئیں۔انہیں نیاز کی چوکی سے اٹھانا نہی ہیں۔''۴۲

انتظار حسین نے سفر کے دوران اپنے وطن ڈبائی کی ابتدائی یادوں کو قلم بند کرتے ہوئے وہاں کے مذہبی، تہذیبی ،ثقافتی اور دیومالائی عناصر کو خاص طور سے پیش کیا ہے ۔اس کے علاوہ بعض کردار کو بھی پرانی تہذیبی و دیومالائی قدر کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔اس سلسلے میں بعض کرداروں کے علاوہ ان کی دادی امّاں کا کردار خاص اہمیت اختیار کر لیتا ہے جس کے پس منظر میں بعض مذہبی عقائد کے علاوہ تہذیبی و دیومالائی قدروں کی نمائندگی ہوتی ہے ۔ان کا یہ اقتباس اس سلسلے کی ایک کڑی ہے:

''یہ ہمیں ایّا اماں ہی نے بتایا تھا کہ پاتال میں سانپوں کا بادشاہ راجا باسٹھ راج کرتا تھا ایک دفعہ ایک برہمن بچے کو کسی سانپ نے ڈس لیا۔اس نے پھڑک کر فورا جان دے دی۔اس کی استری بہت روئی پیٹی۔پھر اسے عجب سوجھی کہ پتی کی لاش کو کمر پر لاد کر پاتال میں اتر گئی۔۔۔راجہ باسٹھ نے فوراً اس سانپ کو طلب کیا اور حکم دیا کہ تو نے برہمن کے بچے کو ڈس لیا۔اب اس کا زہر چوس۔اے لو اس نے دم کے دم میں وہ سارا زہر جو اس کے اندر سرائیت کر گیا تھا، چوس لیا اور وہ بھلا چنگا ہو گیا۔''(صفحہ۔۲۸)

تقسیم ہند کے سلسلے میں جہاں انہوں نے اپنی ہجرت اور پاکستان میں قیام اور وہاں کے رچنے بسنے کا تذکرہ کافی تفصیل سے کیا ہے وہیں اس کے ردّعمل میں ان کا کرب اور ادبی محفلوں کے ذکر میں ان کی وارفتگی اور ذوق وشوق غیر معمولی غیر معمولی نظر

آتا ہے۔ پریم چند فیلوشپ کے موقع پر انہوں نے ہندوستان کے طویل سفر کے دوران کئی مقامات کا سفر کیا۔ کئی ادبی محفلوں میں انہوں نے شرکت کی اور ساتھ ہی کئی یونیورسٹیوں کی سیر کی اور وہاں کے نظام تعلیم کا جائزہ بھی لیا۔ اس دوران دوستوں اور مصنفوں سے ملاقات، ان کے ساتھ سیر و تفریح اور گزرے اوقات کا بیان بڑے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں کہ اس کا نقش ذہن پر مرتب ہو جاتا ہے۔ وہ جہاں بعض ہندوستانی اور پاکستانی دوستوں کا تذکرہ کرتے ہیں وہاں محبت، خلوص اور سادگی نظر آتی ہے۔

غرض کہ انتظار حسین کا یہ سفرنامہ اپنی انفرادیت اور زبان و بیان کی دلکشی کے سبب ایک اہم کارنامہ ہے۔ جس میں اپنے عہد کے ادبی، تہذیبی و ثقافتی غرض تمام پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔

☆☆☆

مجتبیٰ حسین کے بارے میں دو ضخیم کتابیں شائع

فن اور شخصیت پر ممتاز اہل قلم کی تحریریں

بین الاقوامی شہرت یافتہ طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کے پچاس سال مکمل ہونے پر ملک کے نامور پبلشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤز دہلی نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر دو نہایت مبسوط کتابیں شائع کی ہیں جن کے نام ہیں ''مجتبیٰ حسین: جیسا دیکھا جیسا پایا'' اور ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، ''مجتبیٰ حسین جیسا دیکھا جیسا پایا'' میں اس نامور ادیب کی شخصیت کے مختلف رنگارنگ پہلوؤں پر ملک اور بیرون ملک کے مشہور اہل قلم کے نہایت دلچسپ تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔ پروفیسر وحید اختر' پروفیسر گوپی چند نارنگ' خواجہ حسن ثانی نظامی' مشفق خواجہ' کنور مہندر سنگھ بیدی سحر' انتظار حسین' پروفیسر شمیم حنفی' فکر تونسوی' پروفیسر نثار احمد فاروقی' ڈاکٹر شہریار' یوسف ناظم' مرزا ظفر الحسن' پروفیسر یوسف سرمست' رفعت سروش' پروفیسر بیگ احساس' دلیپ سنگھ' نریندر لوتھر' علی باقر' کے ایل نارنگ ساقی اور کئی دوسرے اہم ادیبوں نے اپنے انداز میں مجتبیٰ حسین کو 'جیسا دیکھا جیسا پایا'' کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کئی شعراء نے منظوم خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ انگریزی میں صاحب طرز ادیب خوشونت سنگھ' محمد علی صدیقی' علی باقر' عارف حسینی' بلراج ورما اور نقی علی کے سیر حاصل مضامین شامل ہیں۔ ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ'' مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا اہم ناقد رہا ہو جو اس منفرد طنز و مزاح نگار کے فن سے متاثر نہ ہوا ہو۔ پروفیسر آل احمد سرور' شمس الرحمٰن فاروقی' صدیق الرحمٰن قدوائی' ڈاکٹر قمر رئیس' جاپانی پروفیسر سوزوکی تاکیشی' پروفیسر مغنی تبسم' ڈاکٹر عتیق اللہ' ڈاکٹر مصطفیٰ کمال' رضیہ فصیح احمد' مصحف اقبال توصیفی' ڈاکٹر اشفاق احمد ورک' علی ظہیر' حسن چشتی' ڈاکٹر افسر کاظمی' زاہد علی خاں' من موہن تلخ' انور سدید' مخمور سعیدی' ڈاکٹر مظفر حنفی' علیم صبا نویدی' قمر علی عباسی' مظہر امام اور کئی دوسرے نقادوں نے مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے فن کے بارے میں بے باکانہ انٹرویوز ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں زبیر رضوی' کمار پاشی' رشید انصاری' حامد اکمل' طاہر مسعود' فیروز عالم' حلیمہ فردوس اور کئی باریک بیں اصحاب کے نام آپ کو ملیں گے۔ دونوں کتابیں اہم اور یادگار تصاویر سے مزین ہیں۔ کتابت طباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ ان دونوں کتابوں کو سید امتیاز الدین اور محمد تقی نے مرتب کیا ہے۔ ہر کتاب کی قیمت ساڑھے چار سو روپے رکھی گئی ہے۔ ان کتابوں کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 3108 وکیل اسٹریٹ' کوچہ پنڈت' لال کنواں' دہلی 6 اور ملک کے اہم بک اسٹالوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

جاں نثار معین

مضمون

ابوالکلام آزاداور حقوقِ نسواں

(۱)

خواتین کی عزت و احترام اور تعلیم سے جوڑ نے کی فکر یں مولانا آزاد کو آباء واجداد سے بچپن ہی سے وراثت میں ملی تھیں۔ اس کا مشاہدہ ان کی بہنوں کی علمی وادبی، سیاسی لیاقت بہت زیادہ تھیں۔ بہنوں میں فاطمہ بیگم تخلص آرزو، حنیفہ بیگم تخلص آبرواور محمودہ بیگم نے شعروسخن سے شغف، خواتین بیداری، اصلاح معاشرہ، جدوجہد آزادی اور تعلیم نسواں کے لیے فعال کردار ادا کئے ہیں۔ ان کے والد متقی پرہیزگار اور مذہبی تھے۔ لیکن دونوں صنف میں کوئی فرق نہیں رکھتے تھے۔ 'اپنے بیٹے اور بیٹیوں کو ایک ساتھ پڑھاتے تھے'۔ا؎ وہ سبھی کو نماز روزہ کے مسائل، فارسی قواعد، نحو، گلستان و بوستان، منطق، شرح تہذیب، فقہ میں شرح وقایہ، ہدایہ، حدیث میں مشکوٰۃ اور دیگر کتابوں کا درس دیتے تھے۔ مولانا آزاد اپنے والدِ محترم کے متعلق کہتے ہیں 'انہوں نے ہماری بہنوں کو بھی اتنا ہی اور ویسے ہی تعلیم کا اہل سمجھا، جیسے ہم کو جیسے آرزو بیگم فقہ کی تمام کتابیں پڑھ چکی تھیں، وہ پورے اعتماد سے والد کی بیماری اور کمزوربصیرت میں تصنیف وتالیف کے کام میں ہاتھ بٹاتی تھیں، بڑی صفائی کے ساتھ مسودے بھی لکھتی تھیں۔ یہاں تک کہ والد کے اسلوب میں خطوط لکھنے اور جوابات دینے میں کافی ماہر تھیں۔ ان کاوشوں میں ان کی والدہ محترمہ کی سرپرستی تھی۔ لکھتے ہیں" میری والدہ حضرت شیخ الحدیث محمد بن طاہر وتری مفتی مدینہ منورہ کی بھانجی تھی، جو اکثر علماءِ حجاز کے استاد حدیث اور شیخ عبداللہ سراج کے بعد مکہ معظّمہ کے آخر محدث تھے۔ ان کے بعد اس درجے کا کوئی شیخ الحدیث حرمین میں پیدا نہیں ہوا۔ مولانا آزاد سے غلطی یہ ہوئی تھی وہ اپنے والد محترم کے مہمان کے لیے ناشائستہ الفاظ یہ کہے تھے 'وہ بڑے گندے آدمی ہیں' تو ان کی امی جاں نے سلیس لہجہ میں نصیحت کی 'میری جان! ایسا نہ کہو ہوسکتا ہے کہ وہ خدا کی نظر میں تم سے اور ہم سے عزیز ہو۔ اس تربیت کے بعد ان کی نگاہ میں والدین کا احترام اور اہمیت زیادہ ہوگئی تھی۔ وہ ماں اور باپ میں تفریق نہیں کرتے تھے۔ جس کا ثبوت 'انتخابِ الہلال' تصنیف کے ابتدائی سطور میں لکھا ہے 'لوگ دنیا میں سیکڑوں قوموں کے محکوم، احباب کے محکوم، استاذ و مرشد کے محکوم، امیروں، حاکموں اور بادشاہوں کے محکوم ہیں۔ لیکن مومن ایک ہی کا محکوم رہتا ہے وہ والدین ہیں۔ اسی لیے انہی کی اطاعت وفرماں برداری کرتا ہے'۵؎ مولانا آزاد کے خیال میں دونوں صنف پر اسلامی حق اور حقوق مساوی ہیں۔ لیکن اسلام نے باپ پر ماں کو زیادہ ترجیح دی ہے۔ جیسے ماں کے قدموں کے نیچے جنّت ہے۔

مولانا آزاد کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ بیگم کہتی ہیں سچ تو یہ ہے کہ فیروز بخت نے بچپن نہیں دیکھا۔ چھ سات برس کی عمر سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ ننھے ننھے کندھوں پر ایک سر ہے جس میں ایک بڑا اُونچا دماغ ہے۔۔۔۔۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں والدین نے ان کی شادی کردی۔ لڑکی کی عمر سات آٹھ برس کی تھی۔ شادی کے وقت مولانا روتے ہوئے کہہ رہے تھے مجھ کو عورتوں میں کیوں لے جایا جارہا ہے۔ ادھر لڑکی بھی رورہی تھی۔

ان کی چھوٹی بہن محمودہ بیگم اکثر بیمار رہتی تھیں۔ لیکن دیگر بہن بھائیوں کی طرح خداداد ذہین با صلاحیت اور شوق سے عربی، فارسی، اردو اور فن خطابت پر عبور حاصل کرچکی تھیں۔ وہ شاعری ہو یا نثر ہر صنف میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکی تھیں۔ بچپن سے ہی مولانا کے درمیان غیر معمولی انس تھا۔ اتنی ذہین تھیں کہ وہ مولانا کی مذہبی روایتوں میں اپنے آپ کو پیش کرتی تھیں۔ ان سے جب بھی عوام کی مخالفت ہوتی تو وہ تنہا ساتھ دیتیں اور ذہنی خلفشار کو ختم کرنے میں اہم کردار انجام دیتی رہیں، تعلیم نسواں کی زبردست، دینی امور میں بھی اعانت کرتی تھیں، وہ دینی محفلوں میں

ذکر رسول فرماتی اور جوش خطابت میں ایسا سماں باندھتیں کہ سامعین مسحور ہو جاتے تھے۔ اِن خوبیوں کی بنا پر تحریک آزادی سے متعلق تقریریں کیں، بھوپال میں ایک لیڈیز کلب قیام کیا (وہ خود سیکریٹری تھیں) اور بڑی بہن اسسٹنٹ سکریٹری تھیں۔ جس کے تحت گھریلو خواتین کو دستور پردہ، پابندیوں سے آگہی، رسم و رواج کی صحیح معلومات، قوم سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنا، ہمسائگی، تعلیم، صحت، تلاوت قرانِ پاک وفلاحی کاموں سے آگہی کر کے تحریک آزادی کی جدو جہد میں حصہ لینے کی ترغیب دینا، اس کام میں نواب سلطان جہاں بیگم، دلہن شاہ بانو بیگم واثر ورسوخ والی خواتین بھی ان کے ساتھ اہم خدمات انجام دی تھیں۔ ان کی خدمات پر یہ نعرے تھے " آبرو بیگم ہماری آبرو قوم ہے، ہومبارک آپ کو اے انڈیا کی مسلمات، ان کے آنے سے ہوا دن عید اور شب برات، جیسے سر سید نے بنایا مردوں کو علم دوست، آبرو بیگم بنائیں گی ہمیں علم دوست، رات کو ہم نے سنا میلاد میں جب ان کا وعظ، مولوی رومی و جامی کا آیا یاد وعظ۔ لیکن آبرو بیگم کی بیماری نے مزید خدمات کرنے نہیں دیا۔ وہ دنیائے فانی سے رخصت ہوگئیں۔ ان نعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی طرح ان کی بہنوں میں بھی قوم کی ترقی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

مولانا آزاد نے زلیخا بیگم (بیوی) پر ملت کو ترجیح دیا۔

مولانا انڈین نیشنل کانگریس صدر کی حیثیت سے دوسری جنگ عظیم کے فیصلہ کن دور اور بھارت چھوڑ تحریک کے دور میں کانگریس کے صدر تھے۔ اس تاریخی اجلاس کے موقع پر کلکتہ سے بمبئی روانگی تھی۔ یہ ان کی اہلیہ زلیخا بیگم کے لیے ایک سانحہ تھا جس کا تذکرہ انہوں نے خود اس طرح کیا تھا "وہ جانتی تھی ان حالات میں میری خاموشی بڑھ جاتی تھی۔ مجھے پسند نہیں تھا خاموشی میں خلل ڈالے۔ اسی لیے وہ بھی خاموش تھی۔۔۔3 گسٹ کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازے تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہ آ گیا تو 13 اگست تک واپسی کا مقصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا کچھ اور نہیں کہا۔ لیکن اگر کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں خشک تھیں، مگر چہرہ اشکبار تھا۔ ان شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے مولانا کی زمانے سے چال الٹی تھی۔ وہ زلیخا بیگم سے معذرت کے ساتھ وطن کی محبت میں اپنے مشن کی طرف جاتے ہوئے یہ کہتے ہیں 'چوبیس برس کی عمر میں جب کہ لوگ عشرت شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں میں اپنی دشت نوردیاں ختم کر کے تلووں کے کانٹے چن رہا تھا۔'

در بیاباں گر بہ شوق کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خار مغیلاں، غم مخوار

گویا اس معاملہ میں بھی اپنی چال زمانہ سے الٹی ہی رہی۔ لوگ زندگی کے جس مرحلہ میں کمر باندھتے ہیں میں کھول رہا تھا۔

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ!
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

اس سلسلہ میں لکھتے ہیں" کبھی ایسا ہوتا ہے ہم پھولوں کی سیج پر لوٹتے ہیں مگر سکون نہیں پاتے۔ کبھی کانٹوں پر چل کر اس کی چُبھن میں راحت و سرور کی لذّت محسوس ہوتی تھی:

بہر کِ گل، زحمت صد خاری باید کشید!

راحت والم کا احساس ہمیں کوئی نہیں دیتا۔ یہ خود ہمارا ہی احساس ہے۔ جو کبھی زخم لگاتا ہے تو کبھی مرہم بن جاتا ہے۔۔۔ جو کچھ کہہ رہا ہوں، فلسفہ نہیں ہے، زندگی کی عام واردات ہیں۔ ان دنوں میں ان کی بیگم پندرہ سولہ سال کی عمر الھڑ پن نوجوانی کا زمانہ اور میاں ہیں کہ جیل جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ایسے میں شادمانیوں اور خوشیوں کے کتنے مواقعے خاندان میں نہ آئے ہوں گے۔۔۔ حسن میں چار چاند لگ رہے ہیں۔ ناز و ادا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا من کی خوشی ہر ہر ادا بچپن اور جوانی کی منزلیں طے کرنا ہے۔ تاکہ وہ زمانہ کے ساتھ الٹی چال چلنے والے کا ساتھ دے سکے۔ اس عبوری دور میں ہم عمروں کے مقابلہ میں اس کا حسن اداس ہے۔۔۔۔ اس میں وہ صرف یادوں میں کھوئی رہتی تھیں کہ کہیں سے کوئی خوشی نصیب ہو جائے، جسے وہ مضبوطی سے پکڑ لے لیکن جو بھی چیز ملتی اس میں میاں کی ناراضگی شامل تھی۔ اس کم سنی کی

اپنی خفگی، ناراضگی اور ناخوشی کے اظہار نے اس سے یہی مطالبہ کیا کہ وہ بھی فطری تقاضے کے ہاتھ مجبور ہو کر کمزور لمحات کی شکار ہو گئی۔ تو میاں نے کیا سلوک کیا تھا اس کے ساتھ اس کا اعتراف خطوط میں مولانا نے خود بڑھاپے میں احمد نگر کی جیل کے زمانے میں کیا تھا۔

مولانا آزاد اپنی بیوی سے متعلق کہتے ہیں 'خود راہ حیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم گزشتہ پچیّس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں، لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی، جو اس کی طبیعت پر غالب آ گئی تھی! میں نے اُس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں کہ شاید اُسے ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا، وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی نیز وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اُس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب کا اظہار ہوگا، تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا، عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلّقات میں باقی رہے گی۔ 1916 میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی، تو وہ اپنا اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی۔ میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لیے اُس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا۔ اس نے پوری کوشش کی میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اُس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمّت اور استقامت سے تمام ناخوشگوار حالات بغیر اف کیے برداشت کرتی رہی۔ وہ ہمیشہ میری فکروں میں شریک رہنے کے ساتھ ساتھ عملی زندگی میں رفیق و مددگار بھی تھی۔ اس سے مولانا اپنی رفیقۂ حیات زلیخا کے تئیں اپنی محبت کے علاوہ صبر و استقامت کا اعتراف، ظاہرداری، تحمّل وضبط کا سخت لحاظ، اندرونی بے چینی، اضطراب جیسے مختلف مسائل، معلومات کا ذکر پُرلطف اور بے تکلفانہ مگر سنجیدگی و متانت کے ساتھ خطوط میں پیش کیا ہے۔

مولانا بیوی کی بیماری معلوم ہونے پر خط میں لکھا 'میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ 1941 میں جب میں نینی جیل میں مقیّد تھا، تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویش خاطر کا موجب ہوگا، مجھے اطلاع نہیں دی گئی لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔ یہی خیال قطب الدین خان اپنے مضمون 'جدو جہد آزاد کا مرد مجاہد ابوالکلام آزاد' میں کیا ہے 'مولانا جس وقت گرفتار ہوئے ان کی اہلیہ زلیخا آزاد علیل تھیں۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ اُن میں ساری باتیں ہوتی تھیں، لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ وہ مولانا کی منشا کو خوب سمجھتی تھی۔ جیسے ان دنوں میں ایک افواہ مشہور ہو رہی تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کرلیا جائیگا۔۔۔ اور ان سے کوئی بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ ان حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی۔ اُس نے وقت کی صورتِ حال کا پوری طرح اندازہ کرلیا تھا۔ مولانا شوقی مزاج تھے لیکن قوم اور جدو جہد آزادی کے لیے زندگی کا بیش قیمت حصہ جیل میں ہی گزرا ان دنوں میں ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ جس کا احساس مولانا کو پوری عمر تھا۔ وہ اپنی بیوی کے حقوق کی ادائیگی صحیح نہیں کر سکے۔ زلیخا مولانا کے دوست کو آخری وقت میں کہتی ہیں " آپ میرے بھائی ہیں۔ آپ کی ہمیشہ شکر گزار رہی ہوں۔ مولانا کا دیدار ممکن نہیں۔ اُن سے کہنا کہ تمہارے ہی نام پر مر رہی ہوں، مگر میرے چلے جانے کا غم نہ کرنا!" ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔ کہنے لگیں 'مولانا کے لیے میرے پاس تو کچھ بھی نہیں!"۔۔۔ ہچکی آئی اب وہاں کچھ نہ تھا۔

کیسے بے درد ہو سفاک ہو تم، جاؤ بھی
آپ ہی ظلم کرو آپ ہی پچھتاؤ بھی

اس وقت اگر مولانا ساتھ ہوتے تو آخری دیدار نصیب ہوتا۔ یہ فطری تقاضہ ہے ہر مرنے والا اپنے رفیقوں کو دیکھنا پسند کرتا ہے۔ لیکن مولانا کی بدنصیبی تھی یہ اطلاع بھی دیر سے ملی۔ اس صدمے میں انہوں نے لکھا 'اس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہوگئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہوگئی۔" یہ غم پوری طرح ہلکا بھی نہ ہوا تھا ان کی چہیتی بہن آبرو بیگم کا تین ماہ بعد انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اور زیادہ غمگیں ہو کر لکھا " مجھے

ان چند دنوں میں برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہوگئے ہیں۔اس طرح وہ زندگی کا بڑا حصہ خودداری اور قوم پرستی میں گزاری جس کی وجہ سے وہ خاندانی فرائض بہتر طریقہ سے نہیں ادا کرسکے۔کبھی بھی انہوں نے اپنی فکر کا دامن نہیں چھوڑا۔ ان کا فلسفہ ہے'راحت واَلم کا حساس ہمیں باہر سے لاکر کوئی نہیں دیا کرتا۔ یہ خود ہمارا ہی احساس ہے جو کبھی زخم لگاتا ہے اور کبھی مرہم بن جاتا ہے۔

جتنے کام مولانا آزاد کے ذمہ تھے اس کے لیے لمبی عمر درکار ہے۔لیکن آپ واحد شخص تھے جو مختصر زندگی پانے کے باوجود اپنی خواہشات کی تکمیل کرنے کے بجائے ملک وملت کے کام میں پوری زندگی لگادی۔ مولانا 15 اپریل 1946 کو مسلم لیگ کے لاہور ریزولوشن کے جواب میں فریا تھا:

"ذرا ہم پاکستان سازی کے منصوبے کے اثرات پر غیر جذباتی ہوکر غور کریں کہ نتائج کیا کیا ہوں گے۔ ہندوستان دوملکوں میں تقسیم ہو جائے گا ایک میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی تو دوسرے میں ہندوؤں کی۔ ہندوستانی ملک میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان ایک معمولی اقلیت کے طور پر جابجا بکھرے ہوں گے۔ وہ ہندو اکثریتی صوبوں میں آج کی بنسبت اور بھی زیادہ کمزور ہوجائیں گے۔ وہ ان خطوں میں گزشتہ ایک ہزار سال سے آباد ہیں اور انھوں نے یہاں ایک مقبول عام مسلم معاشرے اور تمدن کی آبیاری کی ہے۔ ان کو جلد ہی یہ احساس ہوجائے گا کہ وہ خارجی اور بے گانے ہوچکے ہیں۔ اقتصادی، علمی اور صنعتی طور سے پسماندہ مسلمان اب خالص ہندوراج کے رحم وکرم پر رہیں گے۔

یہ خیال عصر حاضر میں مسلم خواتین کی بگڑتے حالات پر سچ ثابت ہو رہا ہے۔ حالانکہ پوری طرح سے اس ملک میں خالص ہندوراج نہ ہوسکا لیکن موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے مسلم حاشیا بردار ہیں۔ چاہے وہ میڈیا کی شکل میں ہو یا معاشرے کی ہر جگہ صنف اور مذہب دونوں لحاظ سے پست ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد کی تمام فکریں ملک وملت کے لیے وقف تھیں۔ وہ انسانی فرائض اور حقوق کی تکمیل کو مومن کا اولین فرض سمجھتے تھے۔ کیوں کہ 'اسلام نے مسلمانوں کو جس طرح زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہے وہ محض اپنی اور اپنے بیوی بچوں کے پیٹ ہی کی زندگی نہیں ہے بلکہ منزل، خاندانی، معاشرتی، جماعتی اور انسانی فرائض کی ادائیگی کی ایک پوری آزمائش ہے۔

مولانا آزاد کے انتقال پر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے آبدیدہ ہوکر کہا'ہندوستان کا آخری مسلمان اٹھ گیا، وہ علم کے شہنشاہ تھے" اس کے علاوہ تمام سیاست داں اور دیگر حکمراں اور عوام غم کے عالم میں بے حال بلک رہے تھے۔ یہاں تک کہ ذاکر حسین کے حواس معطل ہوگئے۔ نیز علما ودین دار طبقہ یتیم سا محسوس کر رہا تھا۔ ادھر زنانہ میں مولانا کی بہن آرزو بیگم تڑپ رہی تھیں۔ اب کوئی آرزو نہیں باقی، بیگم ارونا آصف علی نے کہا" وہ عظیم رہنما تھے اور اسلام کی بولتی ہوئی تصویر تھے۔

اور سینکڑوں دوسری خواتین جمع تھیں۔ اندرا گاندھی کہہ رہی تھی" ہندوستان کا نور بجھ گیا" اور ارونا رو رہی تھیں "ہم ایک عظمت سے محروم ہوگئے" سب سے قبل صدر جمہوریہ نے پھول چڑھائے، پھر وزیر اعظم نے اس کے بعد غیر ملکی سفراء نے کئی ہزار برقعہ پوش خواتین مولانا کی میت کو دیکھتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں، ان کے ہونٹوں پر ایک ہی بول تھا" مولانا آپ بھی چلے گئے، ہمیں کس کے سپرد کیا ہے؟"۔ ہندو دیویاں اور کنیائیں مولانا کی نعش کو ہاتھ باندھ کر پرنام کرتی رہیں۔

(۲)

مولانا آزاد نے ہر شعبوں میں نمایاں کامرانی، نسائی فکر میں پختگی، متضاد، مختلف محاذوں پر اپنی اہمیت ثابت کی نیز ان کی دوراندیشی نیہر بدلتے نقش پر اپنی توجہ مبذول کی۔ مذہبی تعلیم کے

ساتھ مابعد جدید کے تمام علوم وفنون حاصل کرنے میں صنفی مساوات کے قائل تھے۔ پدرانہ نظام کے تحت خواتین محکوم ہوگئیں اور کافی حد تک جنسی تفریقات موسوم ہوگئی ہیں۔ اس کے متبدل مولانا مطالعاتِ نسواں کے یکساں مواقع فراہم کرنے کی حتیٰ الامکان کوششیں کی ہیں۔ کیوں کہ 'انسان فطرتاً مادہ پرست ہے اس لیے مادی چیزوں کو اپنا حقیقی سرمایہ سمجھتا ہے۔ لیکن مادیات کا آب ورنگ اس کو بھی مسحور بنا دیتا ہے۔

دونوں صنفوں کی برتری یا مساویانہ بحثیں مغرب کے زیرِ اثر عرصۂ دراز سے آئی ہیں۔ جو کُلی مساواتِ نسواں کے نعرے اور پردے کے مسائل بنیادی موضوع ہیں۔ اس مہم کے تناظر میں علماءِ کرام نے دینی کتابوں کے ذریعہ تحریروں سے نہ صرف صنفی مساوات بلکہ اسلامی حجاب کی مصلحتوں کی وضاحت کی ان کاوشوں کو مصر کے فرید وجدی آفندی نے 'المرأۃ المسلمۃ' کے نام سے ایک کتاب لکھ کر یہ سوالات پیدا اُٹھائے۔ عورت کیا ہے؟ عورت کے قُدرتی فرائض کیا ہیں؟ کیا مرد اور عورت جسمانی طاقت میں مساوی ہیں؟ کیا عورت کو مردوں سے پردہ کرنا چاہیے؟ کیا پردہ عورتوں کے لیے غلامی کی علامت ہے؟ کیا عورت کی آزادی کا منافی ہے؟ کیا پردہ عورتوں کی ترقی وکمال کا مانع ہے؟ کیا پردہ کا عالمی اثر زائل ہو سکتا ہے؟ کیا موجودہ مادی مدنیّت کی عورتیں کامل عورتیں ہیں؟ مسلمان عورت کی تعلیم کا احسن طریقہ کیا ہے؟۔ ان سولات کے عالمانہ جوابات مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو ترجمہ 'مسلمان عورت' کے نام سے کر کے مقدمہ اور آخر میں محاصل تحریر کیا ہے۔ تا کہ خواتین کی فلاحی، بہتری اور مساوی حیثیت ہو سکے۔ یہ تمام جوابات قدیم اور جدید دونوں گروہوں کی درمیانی حدّ فاصل کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں:

۱۔ انسان فطرتاً آزاد ہے اس میں کسی قسم کی خصوصیّت نہیں ہے۔ پھر وہ کونسا معیار ہے جس کی بنا پر انسانوں کا ایک گروہ آزادی سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ دُوسرا محروم؟ ان سوالات کو مولانا نے بجا فرمایا ہے۔ فطری تقاضے اور صنفی مساوات کے باہم متضاد تفریقات اور پستی کے اہم نکات پر واضح طور پر اظہارِ خیال یوں کیا ہے۔ جب انسانی قویٰ کی نشو ونما تمدّنی اور شائستہ ضروری ہے تو کیا وجہ ہے خواتین عقلی نشو ونما سے محروم رکھی جائیں؟ مردوں نے علوم و فنون، انتظام، سیاست اور دُنیا کے تمام تمدّنی مشاغل میں خواتین کو محروم رکھ کر اپنے لیے مخصوص کر لیے ہیں، جس کے تحت لڑکیوں کو تعلیم نہیں دی جاتی اگر دی بھی جاتی ہے تو صرف معمولی۔ کیا وہ انسان نہیں ہیں؟ کیا ان میں دماغی قوتیں موجود نہیں ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا یہ صریح ظلم نہیں ہے؟ علمی دنیا کے شائستہ مشاغل سے انھیں یک تخت محروم کر دیا جائے۔ یہ سوالات سماج کے لیے پیدا کیے ہیں۔ جس کے لیے موجودہ تحریکات سے نسائی تحفظ اور حقوق دلانے کے بیسیوں اسکیمات قائم کی جا رہی ہیں۔ لیکن حقیقت میں اسلام کا آئینی نقطہ ہے جو مولانا کی بنیادی فکروں میں شامل ہے اور ان کے خیال کے مطابق عورت کو مابعد جدید طرز میں ازسرِ نو Deconstruct کرنا چاہیے۔ ان فکروں سے جہاں مرد اعلیٰ ابتر کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ وہیں خواتین بھی مواقع پاتے ہی مرد سے بہتر خدمات انجام دے رہی ہیں۔

۲۔ آج بھی زیادہ تر خواتین علم سے ناآشنا ہیں کیوں کہ تمام تمدّنی اختیارات مردوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں عورت میں دماغی صلاحیّت کم ہوتی ہے۔ علم تشریح اور فزیالوجی کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے۔ دونوں صنف کی دماغی قوّت بالکل برابر ہے، اس وجہ سے انہیں عام آزادی دی گئی ہے، یورپی خواتین ہر امور میں مردوں کے برابر خدمات انجام دے رہی ہیں چاہے ڈاکٹر ہو یا پروفیسر ہر میدان میں برابر شریک ہو رہی ہیں اور ترقی بھی کر رہی ہیں۔ اگر انھیں مردوں کے تسلّط سے نجات ملے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے موقع فراہم ہوئے تو وہ کسی سے کم ثابت نہیں ہو سکتیں۔ مولانا جہاں نسائی مساوات کی تاویلات پیش کی ہیں وہیں مشرقی ومغربی رکاوٹوں سے متعلق اپنا متصورہ نقطہ پیش کیا ہے۔

۳۔ مشرق نے ظالمانہ رائے خواتین سے متعلق زمانہ جاہلیّت میں قائم کی تھی جو آج بھی جاری ہے۔ مسلمان خاتون عام

طور پر ناقصات العقل اور وَالدّین فتنہ وفساد کی جڑ سمجھتے ہیں۔ بر خلاف اس کے یورپ خواتین کی غیر معمولی عزّت اور احترام کرتا ہے اور مردوں سے کسی امر میں کم نہیں سمجھتا۔

صنفی مساوات کے یہ مدّلل ومتوازن جوابات قدیم و جدید دونوں گروہوں کے سوالوں کے لیے ہیں۔ مولانا مذہب کو غیر ضروری سمجھتے ہیں نہ جدید علوم کو۔ اسی لیے تمام غلط فہمیوں پر درست تجاویز پیش کی ہیں۔ خاص کر نئے گروہوں نے جہاں پردے سے متعلق یورپ کے اثرات سے خرابیاں دکھائی ہیں۔ اس پر بھی انہوں نے اپنے فہم وادراک اور وسیع النظری سے خواتین کی ترقی کے لیے نئے راستے دکھانے کی کوشش کی ہیں۔ مشترکہ کلچر کی پرزور وکالت فرمائی ہیں۔ ہندوستانی ثقافت کی بے وجہ تھوپے گئے رسوم کے خلاف سخت تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں قوم کا سنورنا بگڑنا تعلیم نسواں کے ہونے پر موقوف ہے۔ غالباً یہی فکریں سر سید احمد خاں کی بھی تھیں۔ مولانا دیگر فکروں کو وقت کے لحاظ سے کم زیادہ ترک کرتے گئے لیکن خواتین کی تعلیم اور ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے لیکن وہ عورت کی حیثیت کو تو کمتر یا غیر مساوی نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن انہوں نے خواتین کی بہتری کو مرد کے ساتھ ایک دوسرے کی امداد سے ہی دنیا کی ترقی وسکوں حاصل کر سکتی ہیں۔ جیسے ان کی تصنیف 'مسلمان عورت' کے محاصل میں پیش کیے گئے نکات کا مختصر خلاصہ یہ ہے:

۱۔ قدرتی طور پر عورت جسمانی اور علم قبول کرنے میں مرد سے کمزور ہے۔ یہ طبعی اور فطری ہے۔ اس کے برعکس عورت ہزار کوششیں کرلیں لیکن جسم اور ادراک کے لحاظ سے مرد کی ہم پلہ نہیں ہوسکتی۔

۲۔ عورت جسمانی توانائی اور وسعتِ معلومات پر موقوف نہیں۔ لیکن روحانی قوت مرد کے بہ نسبت بہت زیادہ اور اعلیٰ ہے۔ اس کے رقیق احساسات زیادہ ہوتے ہیں اور شعوری سطح بھی کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ اپنے حقوق معاف کر کے دوسرا کا ادا کرنے کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔ اگر یہ فطری قوتیں صحیح قواعد کے مطابق نشو ونما پائیں تو حقوق کی حفاظت وتائید کے لیے بھی مرد کی محتاج نہ رہے گی، بلکہ ان صلاحیتوں کے استعمال سے معاشرت کو اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا سکتی ہے۔ نیز وہ کسی معاملہ میں اپنی پہچان بنالے گی۔ لیکن قدرت کا یہ فیصلہ ہے عورت کی اندرونی قوتیں اسی وقت نشو ونما پا سکتی ہیں جب مرد کے زیر اثر وحفاظت میں زندگی گزارے۔ خواہ وہ مرد پر فوقیت پالے یا اپنا بندۂ بےدام ہی کیوں نہ بنالے پھر بھی اس کی ذات کے لیے مناسب نہیں۔ وہ مرد کو اپنی فطری خوبیوں کے دام میں اسیر کر بھی لیں تو اس کی فطری محبت کی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے اور ایک ایسی کشمکش میں گرفتار ہوجاتی ہے جسے وہ خود پسند نہیں کرتی۔

۳۔ عورت کی کامیابی بیوی یا ماں بن کر بچوں کو درست تربیت دینے میں ہے۔ بلکہ اس کے ملکات کا نشو ونما اور اندرونی جذبات کی تہذیب ودرستی اسی قدرتی نظام میں ہے۔ اور وہ اپنے وجود کا حق ادا کریں، کیونکہ قدرت نے جسمانی اور روحانی اعتبار سے اس کی اہم ذمہ داری ہے۔

۴۔ عورت کا مردوں کے کاروبار میں حصہ لینا، خارجی زندگی کے خطرناک معرکوں میں اس کی شریک ہونے سے اس کے فطری جذبات قتل ہو رہے ہیں، اپنے ملکات کو مٹا رہی ہے اور اپنی رونق اور طراوت کو پژمردہ، اپنی ترکیب کو خراب اور اپنی قوم کے جسم میں خلل پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یورپین خواتین کا منزل زندگی کے دائرہ سے قدم نکالنا ان ممالک کے علما کی نگاہوں میں قوم کے دل اور جگر پر زخم کاری نظر آتا ہے۔ اس بات کی غمازی نظر آرہی ہے مرد چاہے تو عورت کو سخت سے سخت مصیبت وآفت میں مبتلا کرسکتا ہے۔

۵۔ عام طور پر نوعِ انسانی کی بہبودی کے لیے عورت کو پردہ میں رہنا ایک ضروری امر ہے۔ یہ اس کی خودمختار استقلال کا ضامن اور حریت کا کفیل ہے، نہ اس کی ذلت کی علامت، اس کے اسیری کا پیش خیمہ، پردہ عورت کے کمال کا مانع نہیں، بلکہ وہ اسے کمال کے ذرائع واسباب مہیا کرنے والا ہے۔ ہر چیز میں کچھ نقصانات بھی ضرور ہوتے ہیں اس لحاظ سے اگر پردہ سے جو بھی جزوی مسائل پیدا ہو تو اس کے بالمقابل جو فائدے مند ہے۔ جیسے

عورت کو اپنے وظیفہ طبعی کے دائرہ سے باہر قدم رکھنے میں مانع ہے، وظیفہ طبعی میں بھی سعادت کا انحصار ہے۔ اسی سے اعلیٰ خصوصیتوں کو نشو و نما دینے کا موقع ملتا ہے۔ جو اس معرکہ زندگی میں اس کے یکتا ہتھیار ہیں۔

۶۔ خواتین میں مادّی مدنیت چاہے جس قدر ظاہری نمائش اور دل فریبی ہو۔ لیکن وہ کامل جنس نسواں کی نمونہ یا کمالِ نسوانی کے راستہ پر چلنے والی ہرگز نہیں ہوسکتی۔ خود یورپ اور امریکہ کے علماء بھی اس پر اعتراض کر رہے ہیں اور قدرتی نظام قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نیز موجودہ تعلیمی نظام کے بھی خلاف ہیں۔

۷۔ خواتین کے لیے جو ہدایتیں اسلامی ہیں وہ فطرت کے مطابق اور موافق ہیں۔ ان سے نسائی تعلیم کے خصائص اور ملکات کو اچھی صورت میں ڈھالنے کا اعلیٰ سانچہ ہے۔ اگر عورت ان اصول کے موافق خصائص کے بنا نشو و نمائی طبعی حدود میں رہے کر اعلیٰ درجہ کی کامل و اکمل بن سکتی ہے۔

۸۔ مسلم خواتین اعلیٰ و اکمل مرکز تک پہنچنے کے لیے صرف علوم ضروریہ کے مبادی سے بے خبر ہے۔ اگر اتنی تعلیم دی جائے تو کوئی نقص باقی نہ رہے گا۔ مولانا آزاد کے مطابق پردہ نسواں کے حامیوں کا پہلو قوی کیا جائے اور معترضین کے حملوں سے محفوظ رکھیں۔ لیکن تعصب اور رسم و رواج کی تقلید کی وجہ سے پردہ کی حمایت نہیں کی ہے۔ پردہ داری پر آمادہ ہو جائیں اور ہمارے ہم آہنگ بن کر ان علاماتِ مرض کو زائل کریں جو ہماری مصیبت کا باعث بن گئی ہیں۔ اس طرح ہم اس مقدس فرض ادا کرسکیں گے جو ہمارا ضمیر قوم و ملت کے لیے ہم پر واجب قرار دیتا ہے۔

اوپر دیے گئے صنف کے قدرتی نظام کے علاوہ مولانا آزاد نے خواتین کی حمایت میں سائنسی تاویلات بھی پیش کی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے ان کے خیالات مذہبی تھے لیکن وہ کسی بھی کام میں مرد اور عورت کو دماغی قوتوں کے اعتبار سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ یہ سچ ہے موجودہ عہد میں جہاں انہیں موقع فراہم ہوئے وہاں دونوں صنف ہر میدان میں مساوی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس وقت خواتین سائنسداں، ڈاکٹر، انجینئر، وکیل نیز ہر شعبہ میں اپنا لوہا منوا رہی ہیں۔ جو یہ جدید تعلیم کا ہی نتیجہ ہے۔ اس ضمن میں مولانا نے بجا فرمایا ہے "اس وقت تک عورتیں علمی لذت سے محض نا آشنا ہیں۔ اور یہ تمام تمدنی میدان مردوں کے قبضہ میں رہا ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا عورت میں مرد جیسی دماغی ترقی کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ انہیں موقعہ ہی کب دیا گیا یورپ نے آج علمِ تشریح اور فیزیالوجی کی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مرد اور عورت دماغی قوتوں میں بالکل برابر ہیں۔ ان کی نظر میں صنفی تفریق فرد کے لحاظ سے بالکل نہیں ہے جس بہترین نمونہ ان نسائی فکر سے متعلق 'ترجمان القرآن' ان کا اعلیٰ نمونہ ہے اور سورۃ النساء کی 34 ویں آیت کی تفسیر میں روایتی غلط فہمیوں کو دلیلوں سے دور کیا ہے:

> "وہ کہتا ہے کہ خدا نے نوع انسان کو مرد اور عورت کی دو جنسوں میں تقسیم کر دیا ہے اور دونوں یکساں طور اپنی ہستی، اپنے اپنے فرائض اور اپنے اپنے عمال رکھتی ہے۔ کارخانہ معاشیت کے لیے جس طرح ایک جنس کی ضرورت تھی، ٹھیک اسی طرح دوسری جنس کی بھی ضرورت تھی۔ انسان کی معاشرتی زندگی کے لیے دو مساوی عنصر ہیں۔ جو اسی لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک مکمل زندگی پیدا کریں۔ البتہ اللہ نے دنیا میں ہر گروہ کو دوسرے گروہ پر خاص خاص باتوں میں مزیّت دی ہے۔ اور ایسی ہی مزیّت مردوں کو بھی عورتوں پر ہے۔ مرد عورتوں کی ضروریاتِ معیشت کے قیام کا ذریعہ ہیں، اس لیے سربراہی اور کارفرمائی کا مقام قدرتی طور پر انھیں کے لیے ہوگیا۔

(بقیہ صفحہ 47 پر)

شمس الہدیٰ دریابادی

ردّعمل

نیا زاویۂ انفراد پر محتاط زاویۂ نگاہ

میں 8 جولائی کو دیوبند سے حیدرآباد واپس ہوا۔ والدہ محترمہ اور بھائیوں سے ملاقات کی غرض سے دیوبند جانا ہوا تھا۔ 10 جولائی کو اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ہم اساتذہ بیٹھے ہوئے تھے۔ دفتر میں ڈاکٹر مسرت جہاں سے ملاقات ہوئی۔ باتوں کے دوران انھوں نے ڈاکٹر نور فاطمہ اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو لکھنو کیمپس مانو کے ایک مضمون کا تذکرہ کیا جو مارچ 2018 کے ''نیا دور'' میں شائع ہوا۔ مضمون کے چند نکات کی طرف انھوں نے اشارہ کرکے کہا کہ میں ابھی اسے واٹس ایپ کرتی ہوں۔ کچھ دیر میں واٹس ایپ پر پورا مضمون میں نے پڑھا۔ خیال آیا کہ اس میں موجود غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ واللہ اس غرض سے میں نے اپنی یہ معروضات پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر نور فاطمہ نے یہاں ڈیڑھ سال کا وقت گزارا وہ بہترین استاد ہیں۔ بڑی پابندی سے کلاس لیتی ہیں۔ طلبہ بھی ان سے مطمئن تھے۔ تمام فیکلٹی ممبران بڑے خوشگوار ماحول میں ان کے ساتھ رہتے تھے۔ کبھی کوئی اتار چڑھاؤ دیکھنے کو نہیں ملا۔ آج بھی شعبے میں الحمد اللہ اچھا ماحول ہے، ایک دن اچانک معلوم ہوا کہ وہ ہمارے شعبے کو چھوڑ کر لکھنؤ کیمپس جارہی ہیں اور انھوں نے وہاں ٹرانسفر کرالیا، کچھ دیر کے لئے ہمیں جھٹکا لگا اور ہمیں مایوسی ہوئی کہ شعبہ ایک لائق استاد سے محروم ہورہا ہیں۔ ہم تمام نے انہیں روکنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے وطن سے قریب رہنا چاہتی تھیں۔ گاہے بہ گاہے ان سے فون پر رابطہ رہتا ہے۔

انسان کی ذاتی زندگی میں اختلاف دوری کا سبب ہوتا ہے مگر علمی زندگی میں اختلاف صحت مند روایات کو جنم دیتا ہے۔ یہ ضروری بھی ہے ورنہ معاشرے میں علمی جمود اور تعطل طاری ہوجائے گا۔ بہرحال یہی سوچ کر ڈاکٹر نور فاطمہ کے مضمون بعنوان ''دیگر لسانی اختلاط کے ساتھ اردو زبان وادب کا نیا زاویۂ انفراد'' پر کچھ لکھنے کی جسارت کررہا ہوں۔ اسے حیدرآباد میں ڈیڑھ سالہ قیام کا ایک رپورتاژ کہا جاسکتا ہے۔ مضمون کے آغاز میں ڈاکٹر نور فاطمہ نے حیدرآباد میں اپنی آمد، یہاں کی خوشگوار فضا، چکا چوند کرنے والی ترقی اور حیدرآبادی تہذیب کی بڑی تعریف کی ہے، ساتھ ہی اردو یونیورسٹی میں ان کا تجربہ، والد محترم کے ساتھ رہائش کے مسائل پر بات کی ہے۔ چونکہ حیدرآباد میں پردے کا ماحول ہندوستان کے کسی بھی شہر سے زیادہ ہے۔ عموماً بے پردگی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا چونکہ ڈاکٹر نور فاطمہ کا تعلق دیوبند سے ہے اس لئے یونیورسٹی کے باحجاب ماحول میں دیگر خواتین کو عجیب لگا کہ وہ پردہ کیوں نہیں کرتی ہیں اور انھیں کسی نے یا کئی نے اس بارے میں کہا۔ بہرحال کسی کو ٹوکنا نامناسب ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر نور فاطمہ نے یونیورسٹی کے ماحول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ '' فضا میں کھلا پن ہے مگر دینی حدود کی پابندی کے ساتھ''۔

حدود کی پابندی کیا ہے۔ دراصل حدود میں پابندی پوشیدہ ہے۔ نظر نظر کا فرق ہے کسی کو تحفظ پابندی دکھائی دیتی ہے۔ کیا حیدرآباد کی مذہبی حد بندی نے یہاں کی لڑکیوں کی تعلیم میں کوئی رکاوٹ پیدا کی اور شمال کے کھلا پن نے وہاں کی تعلیمی شرح میں اضافہ کیا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ شمالی ہند کا کوئی خطہ یا شہر حیدرآباد کی باپردہ اور مذہبی پابندیوں والی لڑکیوں کی تعلیم کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ڈاکٹر، انجینئر پروفیسر، ٹیچر بڑے بڑے ہوٹلوں کے

استقبالیہ، سپر بازاروں کے کاؤنٹروں اور آئی ٹی کمپنیوں میں کام کرنے والی، اعلیٰ تعلیمی اداروں ،دانش گاہوں (صرف مانو کی تخصیص نہیں) غرضیکہ زندگی کے تمام شعبوں میں باحجاب اور برقعہ نشین خواتین اور لڑکیاں نظر آئیں گی جیسے لباس انسانی جسم کا اٹوٹ حصہ ہے ویسے ہی حیدرآباد میں تمام تر نہیں ! دعویٰ ہو جائے گا بلکہ بیش تر لڑکیاں حجاب اور پردہ کو اپنے جسم کا لازمی حصہ سمجھتی ہیں۔آپ یہ بات ذہن سے بالکل نکال دیجئے کہ میں مذہب کی حمایت اور اس کی تبلیغ کر رہا ہوں بلکہ سنجیدہ ذہن ،عقل سلیم اور خالص استدلالی طریقہ سے آپ پرکھئے کہ اگر پردہ دنیا کی ترقی اور تعلیم کے حصول میں رکاوٹ کا سبب ہوتا تو یقیناً حیدرآباد کی لڑکیاں اور خواتین ہندوستان کی سب سے پسماندہ اور جاہل ہوتیں مگر نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ چنانچہ مجھے افسوس ہے کہ ڈاکٹر نور فاطمہ نے یہاں پردہ سے متعلق بے محل تذکرہ کیوں چھیڑا۔ ہاں! شاید اس لئے کہ خود انھیں چھیڑا گیا کہ وہ پردہ کیوں نہیں کرتیں۔ بے شک یہ زیادتی ان کے ساتھ کی گئی۔ میرا بھی ماننا ہے کہ ہر ایک کو اپنی مرضی سے جینے کا حق دینا چاہئے اس میں کوئی مخل نہ ہو ورنہ بے محل ٹوکنے سے بعض اچھی چیزوں سے بھی نفرت ہو جاتی ہے۔ اسی ضمن میں ''دیوبند کا ہونا باعثِ فخر'' کہہ کر پھر الجھن پیدا کردی کہ فخر کیوں ہے کیا دیوبند ''پیرس'' ہے۔؟ یہ واقعہ ہے کہ پوری دنیا میں ''دیوبند'' سے متعلق جو تصور ہے وہ دیوبند نام کے چھوٹے سے قصبے کا تصور نہیں ہے بلکہ نظامِ فکر اور مسلک و مشرب کا ہے جو وہاں سے چلا جس سے انکار اور اعراض ممکن نہیں۔ اس لئے ''دیوبند'' کا نام سنتے ہی لوگوں کے ذہنوں میں ابھرے ہوئے اس فکری رویے کے تصور کو کھرچ نہیں سکتے۔ چنانچہ ڈاکٹر نور فاطمہ کو نبرد آزما ہونے کے لئے تیار ہونا چاہئے ورنہ دوسری صورت میں وہاں سے اپنی نسبت کو پوشیدہ رکھیں ورنہ خوامخواہ خود انھیں اور دوسروں کو بھی بدمزگی پیدا ہوتی رہے گی۔

''حیدرآباد میں بھی اردو کی تہذیب و تمدن کا عام طور پر ماحول پر مذہبی غلبہ زیادہ ہے''۔ اس جملے میں وہ کیا کہنا چاہتی ہیں غیر واضح ہے۔ شاید یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اردو تہذیب و تمدن پر مذہب کے اثرات ابھی بھی کیوں باقی ہیں؟ خصوصاً حیدرآباد میں۔ مذہب کے نام پر پڑوس کا ملک وجود میں آگیا۔ شمالی ہند اس حادثے سے متاثر رہا اسی لئے شاید اردو کے وجود کو خطرہ سمجھتے ہوئے (حالانکہ ایسا نہیں ہے) اردو کے بہی خواہ اس بات کی کوشش میں لگ گئے کہ اردو تہذیب و تمدن کا مذہب سے کوئی لینا دینا نہیں ویسے یہ کوشش 1947 سے پہلے ایک مخصوص تحریک کے جنم لیتے ہی شروع ہوگئی تھی۔ اس موقع پر مجھے دہلی میں ریسرچ کے دوران پیش آئے پُر لطف واقعات یاد آرہے ہیں۔ میں اپنے ایک استاد کو جب بھی ''السلام ُعلیکم'' کہتا تو وہ ہمیشہ جواب میں'' آداب عرض'' کہتے۔ بہرحال میں نے نہ سلام کرنا ترک کیا اور نہ ہی انھوں نے آداب عرض کہنا چھوڑا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب طالبان افغانستان پر غلبہ حاصل کر رہے تھے۔ ایک دن سوئے اتفاق میرے سر پر عمامہ تھا دیکھتے ہی پروفیسر موصوف کہتے رہے ''اچھا! اچھا! سر پر عمامہ باندھ رکھا ہے میں سمجھ رہا ہوں یہ کس چیز کی علامت ہے''۔ ایک دفعہ میں مفوضہ تیار کر کے اپنے ایک اور استاد کے پاس لے کر گیا جلی حروف میں عنوان ہرے رنگ کے اسکیچ پین سے لکھا تھا شاید اس وقت میرے پاس کالا یا نیلا اسکیچ پین نہیں رہا ہوگا اسے ہاتھوں میں لیتے ہی کہا ''ہوں! ہرے رنگ کے قلم کا استعمال کیا ہے''میں بھولے پن سے ان کا چہرہ دیکھتا رہا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اتنے میں میرے ایک چالاک درسی ساتھی نے اپنا مفوضہ بڑھایا'' سر یہ دیکھئے میری سرخ سیاہی اور لال سلام''۔ اس مفوضہ پر شاید انھیں زیادہ نمبرات ملے۔ ایک تیسرے محترم پروفیسر رمضان المبارک میں جب کلاس روم میں آتے تو دورانِ درس چائے کی

پیالی منگاتے۔چائے پیتے جاتے اور یہ کہتے جاتے کہ ’’معاف کیجیے گا آپ کا روزہ ہے‘‘۔

بہرحال بات دور تک چلی گئی یہ واقعہ ہے کہ تقسیم وطن کے اثرات پھر اس کے منفی نتائج سے حیدرآباد محفوظ رہا۔گرچہ سقوط حیدرآباد نے یہاں کی تہذیبی میراث کو زبردست نقصان پہنچایا۔ترقی پسند تحریک اپنے دورعروج میں حیدرآباد کی ادبی فضا پر بھی چھائی رہی۔مگر ان سب کے باوجود یہاں کی اردو تہذیب پر مذہب کا اثر باقی رہا جس کی طرف ڈاکٹر نور فاطمہ نے اشارہ کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ واقعی یہاں اردو تہذیب دکھائی دیتی ہے بہ نسبت شمالی ہند کے۔کہ ادب کی سرپرستی کرنے والے الگ ہیں اور زبان کی حفاظت کرنے والے علیحدہ۔اگر دونوں کا اتفاق ہو جائے تو وہاں اردو تہذیب پھر سے پروان چڑھ سکتی ہے۔

جس پیراگراف کا میں تجزیہ کر رہا ہوں اس میں اپنی یونیورسٹی کا نام فاضل محقق نے شاید بے دھیانی سے لکھا ہے کیونکہ ابو الکلام کا اضافہ کر دیا۔خیر یہ بھول چوک ہو جاتی ہے۔مگر جس اجنبی خاتون نے گلے لگا کر اپنے کوارٹر (یونیورسٹی کیمپس) میں ایک غریب الوطن تنہا خاتون کو سال بھر سے زائد عرصہ تک سائبان فراہم کیا بلکہ ان کی محبت وخلوص میں محترمہ کی آنکھیں نم بھی ہو جاتی ہیں۔پھر بھی ان کا نام بتانا بھول گئیں۔میری نظر میں یہ بھول دانستہ ہے میں بتا دیتا ہوں اس اجنبی خاتون کا نام ڈاکٹر کہکشاں لطیف اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ ترجمہ جو پوری یونیورسٹی میں ’’بے ضرر‘‘ خاتون کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔اردو تہذیب وتمدن اور حیدرآبادی ثقافت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر نور فاطمہ دکنی زبان کی طرف مراجعت کرتی ہیں۔حیران کن انداز سے حیدرآباد کی بول چال میں استعمال ہونے والے الفاظ اور جملوں کی مثالیں دی ہیں اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے ڈیڑھ سالہ قیام کے دوران محترمہ نے حیدرآبادی زبان کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا اور اس سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔مگر یہاں پر تضحیک اور احساس برتری کا پہلو غالب ہو گیا ہے۔یہ ملحوظ خاطر رہے کہ ہر علاقے کا اپنا لب و لہجہ ہوتا ہے۔اگر حیدرآباد میں ق کا تلفظ (خ) میں بدل جاتا ہے تو یوپی بہار میں خ (کھ) میں اور ش (س) میں، ز ذ ظ اور ض (ج) میں بدل جاتا ہے۔پنجاب میں ق کا تلفظ ک رہ جاتا ہے۔سنا ہے کہ شاعر مشرق بھی اکبال بولتے تھے۔کشمیری سائنس کو ہمیشہ سائنس (ن پر زبر کے ساتھ) بولتے ہیں۔دیوبند میں ہر لفظ کو مشدد کر دیتے ہیں تو نے روٹی کھالی (کیا آپ نے کھانا تناول فرمایا)۔’’آپ‘‘ بولنا تو وہاں جانتے ہی نہیں دوآبہ کے علاقے میں باپ اپنے بیٹے بیٹیوں کو بڑے مزے سے لونڈا، لونڈی، چھوکرا، چھوکری کہہ کر مخاطب کرتے ہیں جو عیب کی بات نہیں جب کہ میر کی شاعری میں لونڈا سے مراد کوئی اور ہے اور لونڈی باندی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ ہر علاقہ کا اپنا تلفظ اور لب ولہجہ ہوتا ہے۔اس لیے معیار بول چال میں نہیں بلکہ تحریر وادب میں تلاش کرنا چاہئے۔اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اساتذہ اردو زبان وادب کے طلبہ وطالبات کے تلفظ پر دھیان نہ دیں۔لب ولہجہ کو درست نہ کریں بلکہ ہم تو مسلسل مشق کراتے رہتے ہیں۔خصوصاً ہر پرچہ کے سمینار کی پیشکشی کے موقع پر شرمندگی سے بچنے کے لیے طلبا فکرمند ہو جاتے ہیں۔کورس مکمل ہوتے ہوتے تلفظ اور لہجہ درست کر لیتے ہیں۔یہ صرف دکن کے طلبہ کی بات نہیں بلکہ یو۔پی اور بہار کے طلبہ (اگر مدارس سے نہیں پڑھے ہیں) پر بھی محنت کرنی پڑتی ہے۔اس کے باوجود کچھ تعداد ایسے طلبا کی بھی ہوتی ہے جو یہ طے کر لیتے ہیں کہ انھیں بدلنا نہیں ہے۔اگر آسمان سے فرشتہ اتر کر بھی ان کی اصلاح کرنا چاہے تو بے سود ہے۔طلبا کی کچھ تعداد ایسی ہے جن کو ہم معذور سمجھتے ہیں مثلاً کیرلا کے طلبا۔یہی کیا کم ہے کہ وہ

اردو لکھ پڑھ رہے ہیں۔جن کا دور دور تک بھی اس زبان سے واسطہ نہیں ہے۔مگر وہ اتنے محنتی ہوتے ہیں کہ مجھے سمسٹر امتحانات کے پرچوں میں ان کے جوابات مواد کے لحاظ سے کسی شمالی ہند کے طالب علم سے کم نہیں لگتے۔یہاں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اردو زبان و ادب کے کئی دبستان رہے ہیں۔حیدرآباد، دہلی،لکھنؤ اور عظیم آباد وغیرہ۔مگر یہ صرف دبستانِ لکھنؤ کو امتیاز حاصل ہے کہ وہاں جو تحریری زبان ہے وہی بول چال کی زبان ہے۔بول چال کے معیار کی جانچ عوام سے ہوتی ہے نہ کہ خواص سے۔چنانچہ اردو والوں کو اکثر جو شکایت لب ولہجہ،قواعد اور تلفظ وغیرہ کی رہتی ہیں وہ اسی لئے کہ دربار،شہر اور اشرافیہ ہی معیار کا محور رہا ہے اور آج بھی وہی ذہنیت ہے۔بین الاقوامی سطح پر تحریر کے لئے زبان کے ایک معیار کو تسلیم کرلیا گیا ہے تو ادب کی ترقی ہوتی رہے گی۔اس لیے بول چال کے پیچھے پڑنا عبث ہے۔امریکیوں نے برطانوی انگریزی کے لب ولہجہ اور املا وغیرہ کو بدل ڈالا۔کچھ لوگ کہیں گے کہ بگاڑ دیا تو کیا فرق پڑ گیا۔کیا امریکہ کی ترقی،علوم کی ترقی اور زبان وادب کی ترقی متاثر ہوئی۔

زبان کے بعد ذائقہ کا ذکر ڈاکٹر نورفاطمہ نے چھیڑ دیا کہ ہوسٹل میں صرف چاول ملتا ہے روٹی کم ملتی ہے۔طلبا کو شکایت رہتی ہے وغیرہ وغیرہ۔یہ بھی کوئی بات ہے ہر جگہ کے اپنے کھانے اور ذائقے ہوتے ہیں جو وہاں کے جغرافیائی حالات،موسم اور مزاج کی مناسبت سے طے کرلیے گئے ہیں۔کیرلا میں کھانے کے لیے بیشتر ناریل کا تیل استعمال کرتے ہیں۔شمالی ہند والے یہ چیز خیال میں بھی نہیں لا سکتے کہ ناریل کا تیل سالن میں استعمال کیا جائے۔دہلی واطراف میں بھینس کا گوشت رغبت سے کھاتے ہیں جبکہ حیدرآباد میں اس کے تذکرے سے ہی منہ بنا لیتے ہیں۔

محترمہ نے لائبریری کنٹین اور ہاسٹل کے حوالے سے یونیورسٹی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے جو انتہائی غیر ذمہ دارانہ رویہ کا غماز ہے۔اگر کوئی یونیورسٹی کسی کی قدر کرتے ہوئے ایک ذمہ دار منصب پر فائز کر کے اس کی خدمات کو حاصل کرنا چاہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خود اس ادارہ کی ناقدری کرتے ہوئے عیب جوئی کی جائے۔اردو یونیورسٹی کی ابھی عمر ہی کیا ہے جس کا اعتراف خود ڈاکٹر نورفاطمہ نے کیا ہے پھر اس کا تقابل کسی ایسے ادارہ سے کرنا کہاں کی دانش مندی ہے جسے قائم ہوئے سوا سو سال کا عرصہ گزر گیا اور اس کے لئے کیا کیا قربانیاں دی گئیں تب جا کر وہاں سے اٹھنے والا علم کا ابر سارے جہاں پر برستا ہے۔اگر کمیاں ہے تو اچھالنے سے نظام صحیح نہیں ہوتا بلکہ فرار کے بجائے طبیعت میں قرار پیدا کر کے قربانی دینی پڑتی ہے۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ آج کا زمانہ سوشل میڈیا اور آئی ٹی کا ہے۔اس نے صرف دو دہوں میں پوری دنیا پر وہ اثرات مرتب کئے ہیں کہ گذشتہ صدیوں میں سائنسی یا صنعتی انقلاب سے وہ تبدیلی دکھائی نہیں دیتی۔WIFI،انٹرنیٹ اور اسمارٹ فون ہمارے جسم کا ایک حصہ ہوگیا ہے جسے الگ نہیں کرسکتے۔نئی نسل ہم سے بہت زیادہ ہوشیار اور بڑی تیز رفتار ہے،کلاس روم میں ہم پڑھاتے ہیں تو یہ نئی نسل ہمارے لیکچر،مطالعہ اور نچوڑ کو اپنی صرف دو انگلیوں کے درمیان رکھکر ہمارا احتساب کرتی ہے یعنی دورانِ لیکچر اپنے اسمارٹ فون پر بڑی چابکدستی سے اخذ کے بجائے مواخذہ کرتی ہیں۔اس عمل سے مجھے بے حد خوشی بھی ہوتی ہے کہ طلبا نے اس کا صحیح استعمال کیا۔حیدرآباد آئی ٹی کا شہر ہے اردو یونیورسٹی اسی زون میں واقع ہے۔ظاہر ہے

یہاں اس سے بچنا ناممکن ہے۔بس ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ان آلات کے استعمال کے رُخ کو موڑ دیں۔ہاتھوں میں کتاب لے کر پڑھنا اب قصۂ پارینہ بنتا جا رہا ہے۔ہم خود اس کے عادی بنتے جا رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ تمام اداروں میں کتب خانوں سے

دلچسپی میں کمی واقع ہوئی ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ کینٹین میں علمی مباحثوں کا وہ کلچر اردو یونیورسٹی میں ابھی فروغ نہیں پاسکا جو جے۔ این۔ یو اور اے۔ ایم۔ یو میں ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اردو یونیورسٹی ہونے کی وجہ سے یہاں نچلے متوسط اور غریب طبقے سے طلبا زیادہ تعداد میں آتے ہیں جن کی ذہنی نشو ونما میں کچھ کمی رہتی ہے لہذا وہ بے باکی اور کھلا پن نہیں ہوتا جو دیگر یونیورسٹیوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

مضمون کے آخری پیراگراف میں ڈاکٹر نور فاطمہ پھر زبان اور فصاحت کا رونا روتی ہیں اس سلسلے میں یہ بات دوبارہ ذہن نشین کرلیں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی دراصل اردو میں علوم حاصل کرنے کی یونیورسٹی ہے نہ کہ ادبی ذوق پیدا کرنے کی۔

ایک اور بات عرض کرتا چلوں کہ اردو میں شاعری، شاعروں اور مشاعروں کی کمی نہیں جو اردو رسم الخط سے نابلد ہے پھر بھی اگر وہ اردو کا شاعر ہے تو تسلیم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا جاتا۔ جہاں تک نقد و تحقیق کا تعلق ہے یہ وہ علمی صحرا ہے جہاں ہاتھ اور قلم جلنے لگتے ہیں۔ اس صحرا میں تھوڑے ہی سہی مگر اردو کے ایسے قدآور نقاد اور محقق موجود ہیں کہ سر اٹھاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ ابھی بڑی ریاضت کی ضرورت ہے۔ دنیا خود تسلیم کرلے گی کہ یہ اردو کا / کی نقاد و محقق ہے۔

آخر میں قارئین سے گزارش ہے کہ تحریر پڑھتے وقت وہ بالکل یہ نہ سمجھیں کہ میں دکن کی حمایت میں کچھ لکھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے قصبہ دریاباد سے اتنی محبت ہے کہ میں نے اسے نام کا جز بنا لیا۔ دیوبند، دریاباد اور لکھنؤ میں میرے اعزہ اور اقارب بڑی تعداد میں رہتے ہیں جن سے برابر میرا تعلق ہے بس میں نے حتی الامکان غیر جانبداری سے کام لیتے ہوئے صرف ایک مضمون کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین

کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب

سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:

زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۶

ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔ ۸۲

راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر

آپ بیتی

نواب میر اصغر حسین کی یادیں

ہمارے نانا (آغا حیدر حسن) کے افغانی سفر سے آپ سب واقف ہیں ہماری بھی آرزو تھی کہ ہم بھی ان ان ملکوں کا سفر کریں جہاں ہمارے نانا ان کے دادا پرنس آغا حسن خان کے ساتھ سفر کیا تھا۔ ان کے سفر نامے مشہور ہیں جن میں انہوں نے اپنے اسفار کا بے حد دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے۔ ان سفر ناموں میں ان ملکوں کی جغرافیائی تاریخی ثقافتی قومی اور تہذیبی زندگی کے کئی گوشے سامنے آتے ہیں۔ ان کی ڈائری جو سفر نامہ بھی ہے اس کا نام ہے۔ The Travel of Mohan Lal Kashmiri اس میں کابل سے اپنے خاندانی رشتوں کا بھی حال ملتا ہے جس پر انہیں فخر ہے۔ انہوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ کابل کو انگریزی فوج سے انہوں نے بچانے میں کیسے کیسے مدد کی امیر کابل ان کے خاندانی وقار سے بہت متاثر تھے بہت عزت دیتے تھے انہیں فارسی زبان اور لب ولہجہ پر خاصا عبور تھا۔ کمال یہ ہے کہ انگریز ہمارے نانا کے دادا پر بہت بھروسا کرتے تھے۔ انہیں انگلستان بھیجا وہاں کوئن وکٹوریا اور دوسری اہم شخصیتوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں وہ جرمنی، رشیا، پرشیا اور ایران بھی گئے۔ ایران کی سرحدیں ازبکستان، افغانستان اور رشیا و تاجکستان سے ملتی ہیں۔ ایران میں مرزا عباس نے انہیں Night of the persian order of .... کا مڈل دیا۔ افغانستان میں وہاں کے شاہ شجع الملک نے Order of Durrani کا مڈل نوازا۔ رشیا میں کنگ فریڈرک ولیم مڈل عطا ہوا۔ انڈیا میں رنجیت سنگھ نے پشاور میں Robe of Order سے سرفراز کیا۔ وہاں کے بادشاہوں سے ان کی ملاقاتیں رہیں۔ اسی سفر میں نہوں پانچ یورپین خواتین سے شادیاں کیں۔ ان میں دو ایک آغا حسن جان کے ساتھ ہندوستان بھی آئیں مگر بہت کم مدت تک ان کے ساتھ رہیں ہندوستان میں ان کے محلّہ میں اور بھی کوئی پچیس خواتین رہتی تھیں ان میں کوئی سکھ اور ہندو بھی تھیں ان کی پہلی بیوی جس نے ہمارے نانا کی پرورش کی اور محلسرا میں رہتی تھیں وہ زینت محل کی رشتہ کی بہن تھیں۔ اس لیے ان کا خاندان لال قلعے سے اچھی طرح واقف تھا آنا جانا بھی تھا۔ 1857ء کے بعد ان کے بعض رشتے داروں نے نواب لوہارو کے یہاں پناہ لی اور باقی پرانی دہلی میں رہ گئے۔ چند سال بعد دہلی کی فضا بدلی تو سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آ گئے۔ اسی لیے ہمارے نانا کے یہاں مرزا غالب کے کافی نوادرات تھے۔ جب محترم فخر الدین علی احمد اور حضرت خواجہ حسن نظامی نے دہلی میں غالب اکیڈیمی قایم کی تو ہمارے نانا نے انہیں غالب کے چوڑے پنچوں کا پاجامہ کرتا اور نیم آستین عطا کیا تھا۔ ہمارے نانا آغا حیدر حسن قبلہ کو یہ افسوس تھا کہ انہوں نے ان ملکوں اور پورے افغانستان کا سفر نہیں کیا جہاں جہاں ان کے دادا گئے تھے۔ ہم سے کہا کرتے تھے ان ریاستوں اور ملکوں کا سفر ضرور کریں۔

پندرہ سال بعد سویٹ یونین سے سنٹرل ایشیا کے ممالک آزاد ہوئے تو ہمیں UNO کی طرف سے یونیسکو بھیجا گیا تا کہ وہاں کے لیے تعلیمی و تربیتی پروگرام کا پروگرام بنا سکیں ہم نے ترکستان، افغانستان، ازبکستان، کرکستان اور غازستان کا سفر کیا۔ جب ازبکستان جانا ہوا تو وہاں کے شاہ نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی انہیں ہمارے ازبکستان وافغانستان سے شاہی روابط کا علم ہو چکا

تھا۔ہمیں اپنا مہمان رکھا اور پورے شاہی اہتمام کے ساتھ ہمارے لیے امیر تیمور کے مقبرے پر جانے کا انتظام کروایا۔ کہتے ہیں امیر تیمور کی قبر بہت کم کسی کے لیے کھولی جاتی ہے ہمارے لیے یہ انتظام بھی خصوصی طور پر کیا گیا۔1940ء میں رشین یہ قبر کھول کر کفن کی حالت دیکھنا چاہ رہے تھے دن مقرر ہوا اتفاق دیکھئے کہ اسی دن جنرل ہٹلر نے حملہ کر دیا۔اس دن سے یہ وہم ہوگیا کہ امیر تیمور کی قبر کو ہرگز نہ کھولا جائے۔ نہ آج تک اسے کسی نے کھولا تھا نہ دیکھا تھا۔ہم جب قبر پر فاتحہ پڑھ رہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ پریسیڈنٹ کا اڈوائزر جو ہمارے ساتھ تھا وہ بھی ہاتھ اٹھائے فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ فاتحہ کے بعد ہم نے پوچھا''میں تو فاتحہ پڑھ رہا تھا آپ کیا پڑھ رہے تھے آپ تو کمیونسٹ ہیں'' کو اس نے جواب دیا۔فاتحہ تو روایتی ہے پڑھ رہا ہوں مگر معنی نہیں معلوم ہمیں اس بات پر بھی حیرانی ہوئی کہ یہ لوگ کھانے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے ہیں اور بعد میں الحمد اللہ کہتے ہیں۔ ان کی پوری تہذیب اسلامی ہے اسی تہذیب پر چلتے ہیں۔ ان کی تعلیم کمیونسٹ نظریات پر منحصر ہے اسکولوں میں دینی تعلیم کے سخت خلاف ہیں۔ہمیں یاد آرہا ہے کہ تاشقند میں ایک منسٹر کی بیوی نے پوچھا تھا بلکہ مشورہ چاہا کہ اس کا لڑکا اسکول کے اوقات کے بعد روزانہ کھیلنے کے لیے جانے کے بجائے مسجد کو جاتا ہے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ کیا کرے اس لڑکے کو دینی مصروفیات کا شوق کہاں سے آگیا، ہم نے جواب دیا میں حیران ہوں 70 برس سے رشین حکومت آپ کی تہذیب کو مٹانا چاہ رہی ہے حتیٰ کہ وہ ترجمے جو فارسی کی اہم شخصیتوں نے ذراسی شاہکاروں کے روسی یا انگریزی زبان میں کیے ہیں ان کی بھی سخت مخالفت کی۔ یہاں تک کہ بعض جگہوں سے ''بسم اللہ'' تک مٹا دیا۔ آج ہم 28 سال بعد غور کر رہے ہیں۔ آج دنیا بدل گئی وقت بدل گیا، حالات بدل گئے آج کے نوجوان جو اپنی اصل تہذیب کی تلاش میں تھے وہ شاید بھٹک گئے یا حالات نے انہیں بدل دیا وہ کیسے شاعر تھے جنہوں نے علمی ادبی تحریکوں کو جنم دیا۔ آگے بڑھایا ملکوں کی تاریخ بدل دی شخصیتوں کی تعمیر کی اور ان کی اولاد کیسے جہالت میں مبتلا ہوگئی؟ یہ اک بڑا سوال ہے۔شاید اس لیے کہ آج کا نوجوان صرف دماغ سے سوچ رہا ہے دل سے نہیں۔ ہمارے نانا جو نظام کالج میں پروفیسر تھے۔ان کا کہنا تھا علم کا اصل تعلق دل سے ہے نہ کہ دماغ سے۔

ترکستان میں وہاں کے پریسڈینٹ مجھے ایک غار میں لے گئے۔ وہ غار بہت بڑا ہے یہ ترکستان کے دارالخلافہ اشقیا آباد کے قریب سے گریک شاعر ہومر نے اپنے رزمیہ Ilyad میں ایک دریا Stykx کا ذکر کیا ہے وہ یہی دریا ہے اس رزمیہ کے ہیرو کا نام اکیلسیز ہے۔ایک دفعہ اکیلسیز کی ماں نے اسے پنڈلیوں سے پکڑ کر منہ کے بل اس دریا میں غوطے دیئے تھے۔اکیلسیز کا سارا بدن پتھر کی طرح سخت ہوگیا صرف پنڈلی میں دم تھا تو مشہور ہوگیا کہ کو کوئی نہیں مار سکتا۔ اشقیا آباد اور ترکستان میں کئی ایک گریک نشانیاں موجود ہیں۔Stykx اس بڑے غار کے اندر ہی اندر کوئی 200 فٹ کی گہرائی میں واقع ہے۔ ہم نے اس دریا میں تیراکی کی جب باہر نکلے تو جسم سردی سے اکڑ گیا تھا مگر یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہمارے بدن کا کچھ نقصان نہیں ہوا جیسے اکیلسیز کا ہوا تھا۔

ترکستان اور افغانستان قوم اپنی گھوڑ سواری کی وجہ سے مشہور ہے ترکستان کے گھوڑے بہت خوب صورت اور مضبوط ہوتے ہیں اپنے ملک کی آن بان سمجھے جاتے ہیں۔انہیں ملک کے باہر لے جانے کی اجازت نہیں۔ تیمور اور ہلاکو کی فوج میں اور دیگر منگول فوجوں میں جو گھوڑے استعمال ہوئے تھے وہ چھوٹے اور تیز تھے لمبے سفر میں ان سے بڑی سہولت رہتی ہے۔ یہ وہ گھوڑے ہیں

جو یوروپ اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بڑے مقبول ہیں۔

وہاں کے پریسیڈینٹ نے ایک بڑی تصویر ان گھوڑوں کی دی جو ترکستان میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ ترکستان میں بڑے غلام علی خاں کے کئی شاگرد ہیں وہ ان کی شاگردی پر فخر بھی کرتے ہیں ایک شاگرد نے ہمیں بڑے غلام علی خاں سے سیکھے کچھ راگ بھی سنائے۔ تان پورہ پر کافی، دیپک اور درباری راگ سنائے تو ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہم ہندوستان میں بیٹھے ہیں اور بڑے غلام علی خاں واستاد بھیم سین جوشی کو جیسے سامنے بیٹھے ہم سن رہے ہیں گانے والے کی آواز بڑی گمبھیر تھی بڑے جوش خروش سے سنا رہا تھا۔ ہم جب وہاں سے جانے لگے تو ان لوگوں کی محبت نے ہمیں تڑپا دیا جو محبت وخلوص ان لوگوں نے ہمیں دیا تھا اسے ہم بھول نہیں سکتے۔ ایک خوب صورت قالین تحفے میں دیا تھا۔

ازبکستان میں سمرقند سے بخارا ہم نے کار میں سفر کیا ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اس جگہ کو قریب سے دیکھیں جہاں بابر پیدا ہوا تھا بچپن گزارا تھا۔ بہار کا زمانہ تھا۔ راستہ بھر میووں کے درخت تھے سیب، آلو بخارے، قوبانی اور انگور وغیرہ دکھائی دے رہے تھے بڑا مزہ آرہا تھا جب ہم بابر کے شہر فرغانہ پہنچے تو ہمیں ریسیو کرنے کے لیے وہاں کا گورنر تیار تھا۔ پانی سے بھرے لوٹے سے ایک بیسن میں ہمارے ہاتھ دھلائے خوشبو سے معطر ایک تو ال پیش کیا تاکہ ہاتھ پونچھ لیں۔ ایک بڑے سے میز پر جس پر بیس پچیس لوگ موجود تھے اپنے بازو ہمیں بٹھایا۔ اس وقت ہمارا بیٹا اور بیٹی ہمارے ساتھ تھے۔ بیٹے کی عمر کوئی آٹھ سال کی تھی اور بیٹی دو سال کی تھی۔ ایک مہمان کے سامنے ایک بڑی سی مشقاب میں دہی رکھا گیا اور دو بڑے نان رکھے گئے مہمان نان کا ایک ٹکڑا لے کر دہی میں ڈبوتا چکھتا اور پھر وہی مشقاب اور نان اپنے بازو والے مہمان کو پیش کرتا جب یہ مشقاب ہمارے بیٹے کے سامنے آئی تو اس نے مشقاب اٹھا کر سارا دہی پی لیا۔ کیوں کہ اس سفر میں ایک تو وہ تھکا ہوا تھا دوسرے پیاسا بھی۔ وہی پی کر مست ہو گیا اور میز پر سر رکھ کر سو گیا۔ دوسرے مہمان حیران ہو گیا۔ گورنر خوب ہنسا اور کہہ کہ "اب ہمیں پتہ چلا کہ یہ ہماری اصل نسل سے ہیں کیوں کہ اس میں تکلف تصنع بالکل نہیں۔ ہم سے وہ دری (قدیم فارسی) میں بات کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بیس پچیس قسم کے پلاؤ میز پر آئے۔ بڑے بڑے مشقاب مہمان ایک مشقاب سے ایک چمچ لے کر چکھ لیتا تو خاساماں اسے اٹھا کر دوسرے کے سامنے پیش کرتا اور پہلے مہمان کے سامنے دوسری مشقاب رکھ دیتا۔ ہمیں علم نہیں تھا کہ اتنے پلاؤ آئیں گے ہم نے تو پہلی مشقاب سے ہی اپنا پیٹ بھر لیا تھا اور جب دوسرے مشقابیں آئیں تو ہم کچھ کھا نہ سکے گورنر صاحب اور دوسرے مہمان ہمیں غور سے دیکھنے لگے تو دیگر مشقابوں سے بھی تھوڑا تھوڑا ہی سہی چکھنا پڑا۔ میز سے اٹھنے میں بڑی مشکل ہوتی ہم نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ہر مشقاب کے بیچوں بیچ چربی کا ایک گولا سا بنا کر رکھا ہوتا تھا۔ ان کے ساتھ طرح طرح کے کباب بھی دیئے گئے تھے ہمیں افسوس ہوا کہ ہم کچھ اور نہ کھا سکے۔ ہمارے نانا بتاتے تھے کہ ان کے بچپن میں دہلی کے محلسرا میں جو باورچنیں کام کرتی تھیں وہ بھی ایسا ہی پکاتی تھیں بوڑھی سرخ وسفید مگر چہرے پر جھریاں نام کو نہیں تھیں۔ جب ہم وہاں سے جانے لگے تو بڑے بڑے ڈبوں میں وہاں کے سوکھے میوے، بادام، پستے، انجیر، آلو بخارے، اخروٹ، قوبانی، چلغوزے، سوکھے سیب، چھوٹی چھوٹی پوڑیوں میں زعفران ہمیں دیئے ہمارے کپڑے اور گاڑی زعفران کی خوشبو سے مہک گئے۔

ازبکستان میں بچوں کو بہت پیار ملتا ہے ہر بچہ وہاں ایک بادشاہ کی طرح ہوتا ہے وہاں کے پریسیڈنٹ اور ان کی بیگم صاحبہ ہمارے بیٹے کو بہت چاہنے لگے تھے ہم سے کہا آپ اگر راضی

ہو جائیں تو ہم آپ کے بیٹے کو اپنے پاس رکھ لیں گے ہمارا وعدہ ہے اسے بہت اچھا رکھیں گے اچھی تعلیم دلائیں گے بیٹے کو وداعی کے وقت ایک خاص قالین بنوا کر دیا جس پر وہاں کے مشہور شاعر 'نوائی' کی تصویر بنی ہوئی تھی بیٹی کو بھی کئی قیمتی تحفے دیئے۔ ازبکستان سے جب کوئی پیرس آتا تو بیٹے کے لیے ضرور تحفے بھیجتے رہے۔

سمرقند اور بخارا میں کافی فرق ہے۔ نہ صرف تہذیب میں موسم اور ماحول میں بھی۔ سمرقند شاندار شاہانہ ٹھاٹ باٹ کا شہر ہے اور بخارا اپنے مٹی کے بنے گھروں، عمارتوں اور سرنگوں پر مفتخر ہے بخارا میں ایرانی تہذیب لکھنو اور حیدرآباد سے ملتی جلتی ہے وہاں انسانیت اور اخلاق پر توجہ دی جاتی ہے۔ سمرقند میں تصنع اور ظاہری شان و شوکت ہے۔ یہ فرق اس لیے ہے کہ سمرقند کی آبادی کو روسی حکومت نے بدل دیا ہے وہاں آج کل مغربیت اور روسیت دکھائی دیتی ہے ٹورازم نے سمرقند کو یکسر بدل دیا ہے اور بخارا اپنی تہذیب کو بچائے رکھنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

جب ہم کابل میں آغا شاہ بابر کی مزار پر کھڑے تھے تو اس خوب صورت جگہ سے دل خوش ہو گیا ہمارے نانا کے دادا کے 150 برس بعد جب ہم اس جگہ پر کھڑے تھے تو یہ سوچ رہے تھے کہ ہمارے نانا وہاں نہ پہنچ سکے مگر ہم وہاں پہنچ گئے کابل کو دیکھا بڑی پُرسکون جگہ تھی۔ یونیسکو نے اسے انٹرنیشنل سائٹ بنا دیا ہے اور آج وہ جگہ ''باغ بابر'' کے نام سے مشہور ہے۔

☆☆☆

(باقی سلسلہ صفحہ 38 سے آگے)

ہم جانتے ہیں مرد و عورت کے احساسات، خیالات اور کیفیات یکساں نہیں ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خواتین کا سماج کے تئیں کوئی اظہاری وسائل نہیں۔ وہ بھی اپنی تخلیقات، نظریات سے سماج کو انقلاب سے دو چار کر سکتی ہیں۔ جیسے اردو ادیباؤں میں صالحہ عابد حسین، عصمت چغتائی، امتیاز علی تاج، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی وغیرہ نے مردوں کے برابر اپنے ہنر کا لوہا منوایا ہے۔ سیاست میں سروجنی نائڈو، اندرا گاندھی، سونیا گاندھی، پرتبھا پاٹیل، ممتا بنرجی، میرا کماری، اوما بھارتی اور برنداکرات وغیرہ کے نام اہم ہیں جنہوں نے موقعے پا کر مرد کے برابر تو کبھی مردوں سے آگے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

مولانا آزاد نے حقوق نسواں پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا اور سماجی رکاوٹوں کی نشاندہی کی جس سے تعلیم نسواں کے نئے نئے تجربات عمل پزیر ہوئے۔ اور وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے بیشتر تاویلات میں خواتین کی ترقی اور جدید تعلیم کو فوقیت دیے۔ اور خواتین یونیورسٹی کے قیام کی اولین تحریک میں مکمل حمایت کیے۔ 4 مارچ سنہ 1918 میں لاہور میں آل انڈیا مسلم لیڈرز کانفرنس کے ایک سالانہ اجلاس میں ان کا پیغام پڑھا گیا جس میں تحریر تھا، یہ جلسہ مسلم یونیورسٹی سے متدعی ہے کہ وہ سرمایہ مسلم یونیورسٹی سے کچھ حصہ، خاص قوانین و قواعد کے ماتحت ایک ایسی جماعت مقرر کرنے کے لیے منتقل کریں جو لڑکیوں کے لیے اپنے خاص حالات و روایات کے مطابق مدارس کا انعقاد، ترتیب نصاب، تالیف و تصنیف، اشاعت کتب نصاب اور اپنے معینہ نصاب میں امتحانات کا کام انجام دیں اور اس طرح تمام ہندوستان کی خواتین کے لیے حقیقی معنوں میں ایک جامعہ اسلامیہ یا یونیورسٹی وجود میں آئے۔ اسی طرح سے ایک اور اہم تاریخی تقریر میں مولانا کی بہن فاطمہ بیگم آرزو نے بطور سکریٹری انجمن خواتین ہند بھوپال، کہا تھا کہ تمام مسلم خواتین کے لیے مخصوص طرز تعلیم اور نصاب و کتب کی ضرورت ہے۔ سرکاری یا امدادی مدارس میں سررشتہ تعلیم کا مجوزہ نصاب پڑھایا جانا چاہیے۔ لہٰذا ہندو بہنوں کے مقابلہ میں مسلمان خواتین کو پردے کے باعث اور بھی زیادہ ایسی آزاد یونیورسٹی کی ضرورت ہے۔ شاید انہیں فکروں سے اللہ تعالیٰ نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی قائم کی ہے۔

☆☆☆

سعیدہ بانو احمد

خودنوشت

ڈگر سے ہٹ کر

بڑی کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

رسم یہ ہے کہ پہلا بچہ میکے میں ہوتا ہے۔ میں پھر چندہ پور ہاؤس سے اپنے والدین کے پاس آگئی۔ مارچ کا مہینہ ختم ہونے والا تھا۔ ڈفرن ہسپتال میں ایک پرائیویٹ وارڈ اور ایک پراوئیٹ نرس کا انتظام کرلیا گیا تھا۔ گرمی بڑھتی جارہی تھی۔ ہم لوگ لان پر سونے لگے۔ ۴؍اپریل کو کوئی رات کے دس بجے مجھے پیٹ میں کچھ درد محسوس ہوا۔ میں نے اندر جا کر ایک چورن پھانک لیا اور آ کر لیٹ گئی۔ درد کم نہیں ہوا تو میں پھر اٹھی تھوڑا چورن اور کھالیا۔ تھوڑی دیر لیٹی رہی درد کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ میں پلنگ پر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کیا کروں۔ اماں پاس ہی دوسرے پلنگ پر سورہی تھیں میرے اٹھنے بیٹھنے کی آہٹ سے اماں کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے پوچھا کہ کیوں بیٹھی ہو۔ میں نے کہا پیٹ میں درد ہورہا ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔

''کب سے ہورہا ہے؟''

''یہی آدھے گھنٹے سے''

''ہمیں جگایا بھی نہیں''۔ یہ کہتی ہوئی اماں کمرے میں گئیں اور مجھے ہسپتال لے جانے کا انتظام کرنے لگیں۔ بارہ بجتے بجتے ہم لوگ ہسپتال پہنچ گئے۔ تین بجے صبح میری جٹھانی بھی آ پہنچیں۔ درد کی شدت بڑھتی جارہی تھی اور ڈاکٹرنی کا اصرار تھا کہ میں ٹہلوں۔ میں کیسے ٹہلوں ڈاکٹر مجھے بہت تکلیف ہے، میں نے کہا۔ بولی یہ تو چھوٹا درد ہے ابھی آپ ٹہل سکتا ہے۔ ڈاکٹرنی بہت خوش مزاجی سے بولیں۔ یہ کشمکش چھ بجے صبح تک جاری رہی پھر مجھے کلوروفارم دے دیا گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے خبر نہیں۔ آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا اماں نرس اور بھابھی جان بیٹھی نظر آئیں۔ میں نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ نہ جانے کتنا عرصہ گزر گیا۔ اب جو میں جاگی تو رات تھی۔ دور ایک ہلکی سی روشنی کا لیمپ کہیں جل رہا تھا۔ غور سے دیکھا تو ایک کالی سی عورت میرے سر پر ٹھنڈا کپڑا رکھ رہی تھی۔

''کیا بجا ہے''میں نے پوچھا۔

''دو بجے ہیں بیگم صاحب''

اب میں نے اور ذہن پر زور دیا کہ یہ سب آخر ہے کیا؟

تب یاد آیا کہ ''میرے بچہ ہونے والا تھا۔ پھر مجھے بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ پھر یقیناً بچہ تو ہوا ہوگا۔ یہ نئی عورت غالباً نئی آیا ہوگی۔ رات کے دو بج رہے ہیں اور یہ میری خدمت کر رہی ہے۔ یہ تو بھاگ جائے گی گھبرا کر'' یہ سارے خیالات دماغ میں آئے اور میں نے آیا سے کہا۔

''تم سوجاؤ جاکے''

''بہت اچھا بیگم صاحبہ''

اور وہ بدستور میرے سر پر ٹھنڈا کپڑا رکھتی رہی۔ مسز ولیمس نرس اٹھ کر میرے پاس آئیں۔ مجھ پر غفلت طاری ہوگئی۔

اب جو آنکھ کھلی تو دن تھا۔ کئی لوگ کمرے میں ادھرادھر بیٹھے نظر آئے۔ بہت پریشان کردیا۔ بچہ پیدا ہونے کے بعد آپ کا بخار تیز ہونا شروع ہوا اور آپ بالکل بے ہوش ہوگئیں۔ ۱۰۵ سے اوپر بخار ہوگیا تھا۔ آپ بالکل غافل تھا۔ اب کتنا بخار ہے۔

''۱۰۰ ہے''

''بچہ کہاں ہے؟''

نرس بچے کو میرے پاس لائیں۔

ساڑھے چھ پونڈ کا ہے، نرس نے بتایا۔

میں حیران نظروں سے اس من سی جان کو دیکھ رہی تھی۔

اس پر ہاتھ رکھا تو وہ بہت بڑا معلوم ہوا۔ میرے شوہر مرے پاس آئے اور بڑی محبت اور تجسس کی نظروں سے بچے کو دیکھتے رہے۔

مجھ پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دعائیں مانگنے لگی کہ یا خدا اب اس بچہ کی خاطر ہماری ازدواجی زندگی میں مصالحت اور خوشگواری پیدا ہو جائے اور ہماری دوری ختم ہو جائے۔

ابن نے پاس کرسی پر بیٹھتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ تکمیل ز.دگی کا یہ معجزہ۔ یہ منی سی جان جس کے ساتھ دنیا کی ساری خوشیاں وابستہ ہوگئی ہیں۔ سارے جذبات اور سارے فرائض سمٹ کر اس بچے میں سمو گئے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں کے لمس میں ہم دونو ں یہی محسوس کر رہے تھے اور دست بدعا تھے کہ یہ بچہ ہماری زندگی میں سکون اور ہم آہنگی پیدا کرے۔

''ابھی آپ کا بخار بالکل اترا نہیں ہے اب آپ آرام کیجئے''

نرس کی آواز آئی۔

ابن میرے پاس بیٹھے رہے ٹھنڈی پٹیاں سر پر رکھی جانے لگیں۔

پانچویں یا چھٹے روز سے بخار کی تیزی کم ہونا شروع ہوئی۔

چودہ دن کے بعد میں ہسپتال سے ننھے اسد کو لے کر گھر واپس ہوئی۔ نئی آیا جو بڑی مستعدی سے ہسپتال میں بچے کو سنبھالے ہوئے تھی گھر پہنچ کر بھی اپنے کام میں بہت ہوشیار ثابت ہوئی۔ بچے کا کام سیکھے ہوئے تھی اور کاہل اور کام چور بالکل نہیں تھی۔ مجھے اطمینان اور خوشی تھی کہ بچے کی پرورش کے لیے ایسی معقول عورت مل گئی۔

گرمی بڑھتی جا رہی تھی اور ہم لوگ چاہ رہے تھے کہ جس قدر جلد ہو سکے مسوری چلے جائیں۔ میرے والد کو جنوری میں دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ ان کے لیے پہاڑ جانا مناسب نہیں تھا۔ ڈاکٹروں سے مشورے کیے گے۔ ہر طرح کا ڈاکٹری معائنہ ہوا اور بہ حالت مجموعی یہ مشورہ دیا کہ پہاڑ چلے جائیں لیکن احتیاط سے رہیں اپنے آپ کو تھکائیں نہیں۔ خود میاں لکھنؤ کی گرمی سے بچنا چاہتے تھے ساتھ ہی نہیں میرا اور بچے کا اس قدر خیال تھا کہ وہ مسوری میں ہم سب کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔

یکم مئی ۱۹۳۴ء کو ہم لوگ میاں کی سرپرستی میں مسوری روانہ ہوگئے۔ وہاں ایک کوٹھی کرایہ پر لے لی گئی تھی اس کی پہلی منزل میں نو کمرے تھے۔ اس کا آدھا حصہ رادھا بھائی، بھابھی نے لے لیا اور نصف حصہ میں چار بیڈ روم تھے ہمارے پاس رہے ایک بڑا سا Glazed Verandah ڈرائنگ روم بنا دیا گیا۔

اب ہر جانب خوب چہل پہل تھی مئی کا مہینہ پلک جھپکتے گزر گیا۔

اسد میرا بچہ اب تقریباً ڈھائی مہینہ کا تھا۔ میرے والد کی توجہ میاں اسد کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ معمول یہ بن گیا کہ صبح نو بجے ناشتے کے وقت آیا بچہ کو لے کر آتی اور میاں اسے اپنی گود میں لٹا کر ایک چمچہ چائے کا چٹاتے رہتے۔ مجھے اپنی نئی معلومات کے تحت یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی مگر میری مجال نہ تھی کہ میاں سے کچھ کہنے کی جرأت کرتی۔

میاں ناشتے کے بعد ٹہلنے چلے جاتے۔ اماں ابن کو جاتے دیکھ کر ہمیشہ کہتیں کہ واپسی میں ڈانڈی لے لیجئے گا۔ آج اماں یہ کہنا بھول گئیں ہم لوگ اپنی دن کی مصروفیتوں میں لگ گئے۔ دن کے بارہ بج گئے ایک بج گیا۔ میاں ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ دن کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا ہم سب میاں کے منتظر تھے

کہ اتنے میں کمپونڈ میں ڈانڈی رکھنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی کسی نے پکارا بچھن میاں جلدی باہر آیئے۔ بھائی کے پیچھے پیچھے میں بھی باہر گئی دیکھا کہ میاں ڈانڈی میں دوہرے بیٹھے ہیں تقریباً بے ہوش پسینے میں شرابور۔ میرے بھائی کو سہارا دے کر اندر لائے۔ پلنگ پر لٹایا درد کی شدت سے میاں بے چین تھے۔

رادھا بھائی کے بھائی کملا بابو ڈاکٹر تھے۔ وہ فوراً آ گئے کچھ دوائیں اور برانڈی وغیرہ دی باہر تیز بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ ایسی بڑھی کہ معلوم ہوتا کہ آج برس کر پھر کبھی پانی نہیں برسے گا۔ ڈاکٹروں کی ٹیلی فون پر ٹیلی فون کر رہی تھی۔ دو ڈاکٹر ملے ایک خاص مسوری کے Dr. Bucher اور دوسرے لکھنو کے مشہور ڈاکٹر، ڈاکٹر عبدالحمید۔ غالباً ڈھائی تین بجے تک دونوں ڈاکٹر پہنچ گئے۔ انجکشن وغیرہ دیا گیا اور چار بجتے بجتے میاں کی طبیعت سنبھل گئی۔ ہم لوگوں نے دن کا کھانا کھایا جو میز پر ابھی تک لگا ہوا تھا۔ اماں میاں کے پاس جا بیٹھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے پرسکون معلوم ہو رہے تھے۔

اسد کے دودھ کا وقت تھا۔ آیا اسے میرے پاس لے آئی۔ یہ اماں کی آواز تھی۔ میں بچے کو آیا کی گود میں پھینکتی ہوئی دوسرے کمرے میں دوڑ پڑی۔ اماں میاں سے لپٹی ہوئی سسکیاں لے رہی تھیں۔ میں نے اماں کو ہٹا کر میاں کے سینے پر اپنا سر رکھا مجھے ان کے دل کی دھڑکن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ نبض بھی چلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور میں اماں سے کہہ رہی تھی کہ نہیں نہیں آپ روئیں نا میاں زندہ ہیں۔ میں یہی کہتی رہی کہ میاں زندہ ہیں۔ اب بہت سے لوگ ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ (میاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سب سے رخصت ہو گئے) میں پھر میاں سے لپٹ گئی۔ اب مجھے بالکل معلوم نہیں کہ کب اور کس طرح مجھے وہاں سے ہٹایا گیا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوتا رہا۔ آنکھ کھولی تو صبح ہو رہی تھی۔ بھابھی جان (میری جٹھانی)، بھابھی رادھا اور بہت سی بیبیاں میرے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے بھابھی جان سے پوچھا کہ اماں کہاں ہیں۔

''دوسرے کمرے میں ہیں''

''میں ان کے پاس جانا چاہتی ہوں''

''وہ رات بھر جاگتی رہی ہیں ابھی تمہارے پاس سے اٹھ کر گئی ہیں انہیں تھوڑا آرام کرنے دو۔ تمہیں دیکھ کر وہ پھر بے چین ہو جائیں گی۔'' بھابھی جان نے سمجھایا۔

میں خاموش ہو گئی۔ بتدریج معلوم ہوا کہ میاں کے ایک دوست سر سلطان احمد ان کے انتقال کی خبر سن کر فوراً ہمارے یہاں پہنچ گئے تھے اور اس وقت کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ ان کے مشورے سے جنازہ مسجد میں رکھوا دیا گیا تھا۔ وہیں سے تجہیز و تکفین کا انتظام ہوتا رہا۔ سارے مرد مسجد جا چکے تھے۔ گھر میں ایک کمرے میں فرش بچھا دیا گیا تھا۔ پرسے کے لیے آنے والی بیبیاں وہاں بٹھائی جا رہی تھیں۔ دن کے گیارہ بارہ بج رہے تھے، اماں ایک کونے میں فرش پر بیٹھی دکھائی دیں۔ میں بہت ضبط کرتی ہوئی ان کے پاس آئی۔ جی چاہ رہا تھا کہ ان سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر روؤں، اماں کی خاموشی اور سکوت کو دیکھ کر میں نے خود کو سنبھالا۔ ضبط کا دامن پھر بھی گھڑی گھڑی مجھ سے چھوٹ جاتا تھا۔ وہ دن بھی کسی طرح گذر گیا۔ تیسرے دن میری بہن اور بہنوئی نینی تال سے آ گئے۔ ہمارا غم اور تازہ ہوا۔ آج میاں کا سیوم تھا۔ عورتوں کی مجلس بھی تھی اور کہیں کسی امام باڑے میں مردوں کی مجلس بھی قرار پائی تھی۔ میری عمر اس وقت ۲۱ برس کی تھی۔ موت سے سمجھوتہ نہیں کرتے بن رہا تھا۔ میں بے قابو ہو کر رو پڑتی تھی۔ اماں دیکھ رہی تھیں کہ مجھ سے اپنے دکھ کا بوجھ سنبھل نہیں رہا ہے۔ پھر میں نے ان کو کسی سے یہ کہتے سنا کہ ''میں ٹھیک ہوں بی بی۔ آپ سعیدہ کو سنبھال لیجئے۔ اس کے باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے''۔

یا خدا یہ اماں کہہ رہی ہیں، جن کے سارے سہارے ختم

ہو گئے ہیں۔ ان کے لیے تو سب کچھ میاں کرتے تھے۔ باہر کی دنیا کی ساری ذمہ داریاں میاں کی تھیں۔ اماں نے کبھی اکیلے سفر نہیں کیا تھا۔ جنس ختم ہو گئی تو میاں کو اطلاع کر دی گئی۔ ہم لوگوں کے کپڑے بننا ہیں۔ میاں نے بزازے کو کہلوا دیا کہ وہ کپڑوں کے تھان لے کر گھر آ جائے۔ ملازمہ عورتیں تھان لے کر اندر آ رہی ہیں۔ اماں پسند کرتیں اور کہلوا دیتیں کہ اتنے اتنے گز فلاں فلاں کپڑا چاہیے۔ غرض کہ سب کچھ ہو جاتا تھا۔ اماں بس گھر کی رونق بنائے تخت پر بیٹھی کچھ نہ کچھ کام کرتی رہتیں۔ میاں گھر میں آتے۔ ماحول بدل جاتا۔ کوئی سر پر دوپٹہ ڈال رہا ہے، نظریں دوڑائی جا رہی ہیں کہ کہیں کوئی چیز میلی تو نہیں ہے، میں بالکل معصوم صورت بن کر سامنے آتی۔ غرض کہ سب کی کوشش یہ ہوتی کہ ہر چیز قاعدے سے ہو جیسا کہ میاں چاہتے تھے۔ اب اماں کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھیں اور میری فکر کر رہی تھیں کہ میرے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ میں کتنی خود غرض ہوں صرف اپنے غم کو لیے بیٹھی ہوں اور اماں کو میری فکر ہے جن لیے ساری دنیا سنسان ہو گئی ہے۔ اس وقت سے میں نے اپنے کو سنبھالنا شروع کیا۔ رونا آتا تو ضبط کرتی یا خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

اب یہ مسئلہ سامنے آیا کہ اماں اکیلی رہی گی۔ میرے بھائی کو بھوپال میں ملازمت مل گئی تھی، شروع میں تو میں نے یہ طے کیا کہ لکھنو پہنچ کر میں اماں کے پاس رہوں گی۔ آخر جولائی میں ہم لوگ لکھنو آ گئے، سنسان گھر، میری اماں کی آزمائش بڑی صبر آزما تھی۔ مگر انہوں نے ہم پر بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ان پر کیا گزر رہی ہے۔ کھانے کی میز پر معمول یہ تھا کہ میاں اماں کے سامنے کباب رکھ دیتے تھے پھر کوئی ترکاری یا دال چاول۔ تو اماں بس وہی چیزیں کھاتیں اگر میاں کسی چیز کو سامنے رکھنے سے بھول جاتے تو وہ ڈش رہ جاتی تھی۔ اس میں اماں کے نخرے نہیں شامل تھے۔ یہ بس ان کا آپس کا انداز تھا جس میں بہت سے ان کہے جذبات شامل تھے۔ ہم لوگوں نے ان دونوں کو کبھی رومانی انداز میں نہیں دیکھا۔ کبھی لڑتے جھگڑتے بحث کرتے بھی نہیں دیکھا۔ دیکھا تو صرف یہی دیکھا کہ گھر میں سکون ہے، ہم آہنگی، محبت اور شفقت کا ماحول ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی نہ جانے کتنی گہرائی سے ایک دوسرے کو سمجھتے تھے کہ آخر دم تک گھر میں خوشگوار فضا بنی رہی۔

لیکن اماں اکیلی زندگی کی ڈور سنبھالنے کو رہ گئی تھیں۔ انہوں نے اف کی نہ ٹھنڈی سانسیں بھریں اور نہ کبھی ہم نے ان کو میاں کا ذکر کرتے سنا۔ خاموشی سے گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئیں۔ سب سے بڑی مشغولیت ان کے لیے ان کا نواسہ میاں اسد بن گئے۔ اسد خدا کے فضل سے اب پانچ مہینہ کے تھے۔ غوں غاں شروع ہو گئی تھی اور ان کی حرکتیں بڑی دلچسپ ہوتی جا رہی تھیں۔

کچھ عرصے سے میری ریڑھ کی ہڈی میں درد رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے میں ہر وقت تھکی تھکی سی رہتی تھی۔ لکھنو کے مشہور ڈاکٹر عبدالحمید سے مشورہ کیا گیا۔ انہوں نے X-Ray وغیرہ کروا کے تشخیص یہ کی کہ مجھے ہڈی کی T.B. ہے۔ اٹھنا بیٹھنا بالکل منع۔ لکڑی کے تخت پر بے حس و حرکت پڑے رہو۔ پھر دیکھا جائے گا کہ آئندہ کیا علاج ہو۔ یا خدا، میرا چھوٹا سا بچہ ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں بالکل پڑ جاؤں۔ ہزاروں چھوٹے چھوٹے کام بچے سے متعلق ہیں۔ اماں کی دیکھ بھال ہے۔ یہ سب کچھ لیٹے لیٹے تو نہیں ہو سکتا ہے۔ بہر حال ڈاکٹر کے احکامات پر عمل تو ضروری تھا ہی۔ میں لٹا دی گئی۔ میری والدہ اور آپا نے بچے کی اور میری تیمارداری سنبھال لی۔ بڑی صبر آزما صورت حال تھی میرے لیے۔ لیکن برداشت تو کرنا ہی تھا۔

ستمبر میں ابن کا تبادلہ لکھنو کا ہو گیا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں چندہ پور ہاؤس منتقل ہو جاؤں، یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اماں پر میری دیکھ بھال کا بوجھ بھاری پڑ رہا ہے وہ ہر صورت حال کا مقابلہ

کرنے والی خاتون تھیں مگر ہم لوگ دیکھ رہے تھے کہ میری اور بچے کی دیکھ بھال انہیں پست کیے دے رہی ہے۔ ساتھ ہی یہ مسئلہ بھی تھا کہ اماں کی صرف نوکروں کے سہارے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ میری بڑی بہن کا مشورہ ہوا کہ وہ اماں کے لیے اپنی کوٹھی سے ملحق دو تین کمروں کا ایک کاٹج بنوا دیں۔ وہاں اماں الگ بھی رہ سکیں گی او رمیری بہن کی موجودگی اور نگرانی بھی ممکن ہو سکے گی۔ چنانچہ یہی کیا گیا۔ میں چندہ پور ہاؤس آ گئی۔ یہاں مشترکہ خاندان کا ماحول تھا۔ تیمارداری کے لیے بھی کئی کئی رشتہ دار بیبیاں حاضر اور تفریح طبع کے لیے بھی۔ دو بڑے بڑے بیڈروم ایک ڈریسنگ روم ایک غسل خانہ اور ایک آفس روم ہم لوگوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ اسد کی آیا اب میری تیمارداری بھی کر رہی تھی۔ بچے کی دیکھ بھال میں بھی کمی نہیں تھی اور موقع ملتا تو ادھر اُدھر کے اور کام بھی پھرتی سے انجام دیتی۔ غرض کہ اس میں ان گنت خوبیاں تھیں۔ مجھے اس نے بہت آرام پہنچایا۔ اس طرح چار مہینے گزر گئے۔ اب ڈاکٹروں کی یہ رائے ہوئی کہ میرے اوپر کے دھڑ پر Plaster of Paris چڑھا دیا جائے۔ اس طرح میری ریڑھ کی ہڈی میں حرکت بالکل نہیں ہوگی اور ریڑھ کی ہڈی کا زخم بھرنے میں مدد ملے گی۔ X-Ray کے لیے مجھے میڈیکل کالج لے جایا گیا ڈاکٹر راگھو نندن لال نے X-Ray کے لیے جب میری ریڑھ کی ہڈی پر انگلی پھیری اور وہ اس مقام پر آئی جہاں درد تا تو میں نے دانت بھینچ کے کہا کہ درد نہیں ہے۔ اب جو X-Ray کا نتیجہ لکھ کر آیا تو اس میں کہا گیا تھا کہ ہڈی کا زخم بھر رہا ہے۔

ڈاکٹر حمید نے X-Ray رپورٹ دیکھی مطمئن ہو کر سر ہلایا اور کہا کہا احتیاطاً Plaster of Paris تو لگا ہی دینا چاہیے۔

Plaster of Paris کا ڈھانچہ اس زمانے میں ممبئی سے بن کر آتا تھا۔ جس میں کم سے کم پندرہ دن لگتے۔ میں نے ڈاکٹر حمید سے التجا کی کہ مجھے پندرہ دن کے لیے چلنے پھرنے کی اجازت دے دیجئے۔ پر آپ مجھے Plaster of Paris میں چن دیجئے گا۔ وہ راضی ہو گئے۔ میں نے فوراً اپنے فیملی ڈاکٹر ڈاکٹر لہری کو بلوایا۔ ان سے ساری روداد بیان کی۔ اپنا جھوٹ بولنا بھی بتایا اور پندرہ دن کی مہلت کی اطلاع بھی دی۔ ڈاکٹر لہری کو شروع سے ہی دوسرے ڈاکٹروں سے اختلاف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ نہ تمہیں بخار رہتا ہے نہ وزن کم ہو رہا ہے۔ ہڈی کی .T.B تمہیں نہیں ہے۔ یہ تمھاری وہ چوٹ ہے جو Skating کرتے ہوئے گرنے میں لگی تھی۔ ڈاکٹر لہری کی فیس ۵ روپے تھی۔ اور یہ بڑے بڑے ڈاکٹر گھر آنے کے ۳۲ اور ہسپتال میں ۱۶ روپے لیتے تھے۔ قصہ مختصر ڈاکٹر لہری کی رائے سے میری ہمت بڑھی اور میں نے پندرہ ن کے بعد بھی پلاسٹر لگوانے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر حمید نے بڑا ڈرایا دھمکایا کہ تھوڑے دنوں میں آپ دوہری ہو جائیں گی۔ کوبڑ نکل آئے گا اگر آپ کہنے نہیں مانیں گی، میں نے کہا کہ دیکھا جائے گا ابھی تو میں چل پھر سکتی ہوں جب مجبور ہو جاؤں گی تو لیٹ، جاؤں گی۔ چندہ پور ہاؤس میں ہم لوگ ۱۹۳۷ء رکر ہے۔

یہاں ہمارے ۸ نجی اختلافات نے سر نہیں اٹھایا۔ اسد بڑے ہو رہے تھے ان کی پیاری پیاری حرکتیں نہ جانے کتنے ناخوشگوار لمحوں کو یاد کروا دیتی تھیں۔ ان کی پہلی سالگرہ بڑے دھوم سے منائی گی۔ ایک بہت بڑی پردہ پارٹی ہوئی جس میں عمائدین شہر کی بیگمات اور رانیوں نے شرکت کی۔ اسد کو موٹروں سے بہت دلچسپی تھی اور مختلف موٹروں کو دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ یہ فورڈ ہے یہ Chevrolet ہے یہ Fiat ہے۔ آسٹن ہے وغیرہ وغیرہ۔ مشکل سے ایک سال کے تھے جب ان کی معلومات کا یہ عالم تھا۔ چنانچہ ان کے لیے ہم لوگوں نے بچوں کی ایک موٹر خرید کر انہیں دی جس سے وہ بے حد خوش ہوئے اور اسے چلانا فوراً سیکھ لیا۔ بیگم علی ظہیر میری بہن نے اس موقع پر چند شعر کہے وہ یہ ہے:

تم انجمن میں ستاروں کی ماہ بن کے رہو

نظر میں خلق کی نور نگاہ بن کے رہو
سعید و با ادب و ہونہار بن کے رہو
رضا کے گھر میں ہمیشہ بہار بن کے رہو

چندہ پور ہاؤس میں بہت چہل پہل رہتی تھی میری ساس بیگم رضا کے پاس ان کی رشتہ دار بیبیاں اورلڑکیاں کئی کئی مہینے آکر رہتی تھیں۔بیگم رضا کا دل بھی بہلا رہتا اورعقیلہ بی بی میری نند بھی اپنی ہم عمرلڑکیوں کے ساتھ ہنستی بولتی رہتیں۔گھر کافی بڑا تھا۔ایک بیڈروم کاظم بھائی اوران کی بیگم صاحب کے لیےان کی آمد کا منتظر رہتا۔وہ جب لکھنوآتے تو چندہ پور ہاؤس میں ہی قیام کرتے۔مشترکہ خاندان میں رہنے کی ایک برکت تو یہ تھی کہ بہت سی ناگوار باتیں دوسروں کی موجودگی کی وجہ سے ٹال دی جاتیں اور پھر وقت کے دھارے میں گھل جاتیں،ابن روٹھتے منتے رہتے۔اسد دوڑتا ہوا سامنے آجاتا اس سے کھیلنے لگتے۔مسعود رضا بھائی صاحب کو پکارتے ہوئے آن موجود ہوتے۔باتوں کا کوئی سلسلہ چھڑ جاتا۔اورابن کا دھیان بٹ جاتا۔مگر انسان کی فطرت بھی عجب ہے چین ملے تو وہ خواہ مخواہ بے چین ہونا شروع کردیتا ہے۔یہاں میں بہت آرام سے رہ رہی تھی۔گھر داری کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔پکا پکایا مل جاتا۔گھر چلانے کے سارے جھنجھٹ میری ساس کے سر تھے۔ساس نند میری دل داری کا بہت خیال رکھتیں۔غرض کہ بڑے ہی فراغت کی زندگی تھی۔لیکن جب ستمبر۱۹۳۷ء میں ابن کا تبادلہ سیتاپور کا ہوا تو میں بےحد خوش ہوئی۔اپنا گھر خود چلانے کی حسرت دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔میری ساس کو یہ پسند نہیں آیا کہنے لگیں۔

''بہت چھوٹی سی جگہ ہےتمہارا دل نہ لگے گا دولہن''

میں تو خواب دیکھ رہی تھی اپنا گھر بنانے کا۔جہاں میں ہی میں ہوں۔ابن کا بیرا ابراہیم اوراسد کی آیا یہ دونوکر ہمارے پاس تھے ہی،ایک باورچی کا انتظام کرنا تھا،وہ کرلیا گیا۔برتن وغیرہ پہلے ہی سے موجود تھے۔وسط ستمبر تک ایک بڑی سی کوٹھی کا آدھا حصہ سیتا پور میں کرایے پر لے لیا گیا۔کوٹھی کے نصف حصہ میں ایک اورسول جج طفیل احمد مقیم تھے۔انہیں ابن پہلے سے جانتے تھے۔چار کمرے ہم لوگوں نے لیے۔مع ایک زنانے مکان کے۔کوٹھی کے وسط میں بہت بڑا ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم تھا۔اسے ہم لوگوں نے مشترکہ قرار دیا۔زنانے مکان کے ساتھ پانچ چھ Servant Quarter تھے جنہیں شاگرد پیشہ کہا جاتا تھا۔بہت بڑا کمپونڈ جس میں باغ کو بنائے رکھنا سارے دن کی مشغولیت ہوسکتی تھی۔

وسط ستمبر تک اسد جواب ماشا اللہ کوئی ساڑھے تین سال کے تھے،اور میں سیتاپور پہنچ گئے۔میں گھر جمانے اورسجانے میں مصروف ہوگئی۔

لکھنو کے تین چار سال کے قیام میں دو تین باتیں قابل ذکر ہیں۔

میرے منجھلے جیٹھ کاظم رضا صاحب کی بڑی رنگین شخصیت تھی۔ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔صوبائی ٹیم کے کپتان چنے گئے تھے۔آواز اچھی تھی۔کوئی استاد مروت خاں کے شاگرد تھے۔ اور کلاسیکی موسیقی سیکھتے تھے۔پھر Tennis،Golf،Bridge ان کھیلوں میں بھی گہری دلچسپی تھی اوران سب سے بڑھ کر جودل آویز صفت تھی وہ یہ کہ بڑے رسیا تھے۔ہمیشہ کسی نہ کسی کے عشق میں مبتلا رہتے۔اس عشق میں ان کی بیوی برابر کی شریک رہتیں۔معشوق کے یہاں اپنی بیگم کو ساتھ لے کر جاتے فرش پرنشست ہے۔ہارمونیم سامنے رکھا ہے۔بھائی جان،کجن پیا کی ٹھمری گارہے ہیں۔معشوقہ کے شوہر بھی گانے سے محظوظ ہورہے ہیں۔رات کے دو بجنے والے ہیں۔محفل برخاست ہوئی۔بھائی جان پولیس میں ایک بڑے عہدے پر مامور تھے۔اگر دوسرے دن چھٹی ہےتو بقول اس شعرکہ

علی الصباح چومردم بہ کاروبار روند
بلاکشان محبت بہ کوئے یار روند

بھائی جان سورج نکلتے ہی معشوقہ کے یہاں پہنچ گئے۔ پھر سارا دن وہیں گزرا۔ رات کو بھی محفل جمی رہی۔

بھائی جان کی تمام معشوقائیں ان کے دوست کی بیویاں یا سرکاری عہدے پر فائز ان کے ہم عصروں کی بیبیاں ہوتی تھیں اور یہ عشق تین چار سال بڑی شدت سے چلتا تھا۔ اس کے بعد التفات کسی اور جانب مبذول ہو جاتا۔ جو کچھ کرتے کھلے بندوں کرتے۔ رمز و کنائے بھی ہوتے۔ معشوقہ کے دوپٹوں میں عطر بھی لگایا جاتا۔ عشق کی بے قراری بھی نظر آتی مگر بیگم ساتھ ساتھ ہیں۔ ورد زبان یہ جملہ ہے کہ ''جو ہمرے میاں کا اچھا لگت ہے او ہم کا اچھا لگت ہے''۔ ۱۹۳۴ء سے لے کر ۱۹۳۷۔۱۹۳۸ بھائی جان میری ایک عزیزہ پر عاشق تھے۔ میں نے ایک دن اپنی عزیزہ سے کہہ بھی دیا کہ۔

''آپ یہ کیا کر رہی ہیں ۔ کیا آپ کے شوہر کو معلوم ہے؟''

''ہاں معلوم ہے''

''تو انہوں نے کیا کہا''

''کچھ نہیں کہنے لگے کہ مجھ سے طلاق مت مانگنا۔ مجھے ملنے جلنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے''۔

یا خدا! یہ عمر رسیدہ لوگوں کے عجیب ردّ عمل ہوتے تھے۔ میرے نزدیک تو بڑا بھاری دھوکہ دیا جا رہا تھا۔ اس کے نتیجے تو بہت خراب نکل سکتے ہیں۔ مگر جب میں نے اپنے خیالات ظاہر کیے تو معلوم ہوا کہ میں ''رائی کا پہاڑ بنا رہی ہوں'' سارا رضا خاندان انگشت بدنداں تھا مگر صاحب معاملہ حضرات اپنی رنگ رلیوں میں لگے رہے اور ہم سب تماشا دیکھتے رہے۔ اتنا ضرور ہوا کہ میرا ان لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کم ہوتا گیا اور میں ان کی محفلوں اور پارٹیوں سے دور رہنے لگی۔ میری عمر کم تھی اور میں اس وقت دو اور دو چار ہی سمجھ سکتی تھی۔ دو اور پانچ بھی ہوتے ہیں یہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ پھر کچھ عرصے بعد بھائی جان کا عشق کسی اور طرف مبذول ہو گیا اور اب میری سمجھ میں کچھ کچھ تو آنے ہی لگا تھا کہ دو اور دو پانچ بھی ہو سکتے ہیں۔

چھوٹے بھائی جان اس قدر باغ و بہار انسان تھے۔ کسی موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے اور بھائی جان معلومات کے دریا بہا رہے ہیں۔ موسیقی کی باریکیوں پر گفتگو کر رہے ہیں۔ مصوری یا دنیا کے مصوروں کے بارے میں کونسا پہلو ہے جس پر بھائی جان روشنی نہیں ڈال سکتے۔ ملک کا کون سا شاعر ہے جس کے اشعار نوک زبان پر نہ ہوں۔ تارخ و جغرافیہ پر گفتگو چھڑ گئی۔ جنگ آزادی کا ذکر آ گیا۔ چھوٹے بھائی جان معلومات کے دریا بہار رہے ہیں۔ نہایت جامہ زیب تھے۔ پولیس کی وردی اور غضب ڈھاتی تھی۔ غرض کہ مجموعی طور سے ایسی شخصیت تھی کہ انہیں سات خون معاف کر دیئے جاتے تھے۔ عاشقی اور معشوقی کھلی کتاب کی طرح کی جاتی تھی اور میرا خیال ہے کہ ذہنی آسودگی چاہے جہاں لے جاتی ہو۔ مگر پاکبازی کی ڈور کو مضبوطی سے تھامے رہتے تھے۔ ادھر سرکاری ذمہ داریاں سنبھالنے میں بھی نمایاں مقام حاصل تھا۔ بے لاگ فیصلے کرتے۔ اطلاع آئی فلاں جگہ ڈاکوؤں نے سر اٹھا رکھا ہے۔ اڈے بنائے ہیں اور عوام کی زندگی حرام کر رکھی ہے۔ مسافروں کو دن دہاڑے لوٹ رہے ہیں۔ اور کاظم رضا صاحب ان کے تعاقب میں دوڑ پڑتے۔ یہ عمل دوش کہلاتا تھا۔ بڑے افسران دو پر اپنے ماتحتوں کو بھیج دیتے کیوں کہ ڈاکوؤں کا سامنا کرنا بڑی بے خوی اور نڈرتا کا کام تھا۔ مگر کاظم رضا صاحب خود اس مہم پر چل پڑتے اور بہت سے معرکے سر کرتے رہتے۔ ان کی انسان دوستی بھی مشہور تھی۔ 'راج' کتاب میں کاظم صاحب کا ذکر سنہری لفظوں میں کیا گیا ہے۔

☆☆☆

شاعری

غزلیں

کوثر صدیقی

اپنے آنچل کو مرے خوں سے بھگو کر رکھ دے
پرچم خواب کو دیوارِ سحر پر رکھ دے

بیٹھا رہنے دے کبوتر کو غٹر غوں کرتا
تیرے ہاتھوں میں جو پتھر ہے زمیں پر رکھ دے

لوحِ بالیں پہ جلا کر مرے زخموں کا چراغ
میری تربت پہ مرے خواب کی چادر رکھ دے

خیر مقدم یہ دل سے میں کروں گا لیکن
آستیں میں ہے جو خنجر اسے باہر رکھ دے

شعلۂ عشق میں ہو جائیں گے ضم سب شعلے
جلتی دنیا کے مسائل مرے سر پر رکھ دے

حق کے میدان میں پھر کون نظر آئے گا
طاق میں تیغِ قلم ہی جو سخنور رکھ دے

وقت گزرا ہے مرے کان میں کہتا کوثرؔ
سیف اٹھا سیف یہ پیمانہ و ساغر رکھ دے

اسلم حنیف

سامنے اک کتاب ادھ کھلی اور میں
بے سبب شمع جلتی ہوئی اور میں
وقت کی کوکھ کا بر محل حادثہ
یہ جہاں، مضطرب زندگی اور میں
ہے صدا ایک نغمے کے ہیں منتظر
دف بجاتی ہوئی خامشی اور میں
کچھ پرند آسمان سے اترتے ہوئے
لطف اندوز جن سے ندی اور میں
جسم پر رینگ اٹھیں بے بدن چیونٹیاں
پھر وہی دھوپ سی چاندنی اور میں
وقت کی شاخ پر خوشنما پھول تھے
وہ گلی حسن کی سادگی اور میں
جسم ڈھلنے لگا رات کی قبر میں
پھر وہی خواب کی آگہی اور میں
گردشِ رنگ و بو مشعلیں اور تو
بے کراں اک خلا، تیرگی اور میں

شاعری

غزلیں

کشور سلطانہ

خوشبو تیری ہر سو پھیلی سارا جنگل مہکے
پھر یہ دھنک لہرائی پھر یہ دھانی آنچل مہکے

شاخ گل سے، رنگ حنا سے نغمہ ہستی گونجا
دل کی دنیا جھوم اٹھی جو شام سے بادل مہکے

آئی ہے موجِ بہاراں، نور بھی ہے مہتابی
چاندنی جب جب رقص کرے گی، رات کا آنچل مہکے

لائی جب پھر شام نگاراں کو جے سے سوغاتیں
خواب ہوئے بیدار تو، تیری آنکھ کا کاجل مہکے

زلف جہاں لہرائی، گھٹائیں چھائیں فسوں بھی جاگا
آئی جب برسات تو پھر یہ خواب بھی چنچل مہکے

کیف اور نور میں ڈوبی ہوئی اک شام حسیں متوالی
دل میں سجی اک کہکشاں سی، راہ میں صندل مہکے

شکر ہے تیرا کشور کو تو نہیں کوئی غم یا رب
ذکر ترا ہے ان سانسوں کا گویا ہر پل مہکے

اشک پر سوز کے یہ گہر آبدار
بے بہا ہو گئی ہ قبائے بہار
سازِ دل نے جو چھیڑے ہیں نغمے ہزار
چشمِ نم اب تو ہونے لگی لالہ زار
زرد پھولوں کی غم گیں سی یہ مہک
جاتے جاتے بھی دیتی گئی ہے بہار
دل کی سر گوشیاں سر اٹھانے لگیں
موسمِ گل پہ چھایا ہے کیسا خمار
خامشی مسکراتی ہے یوں بار بار
قطرہ قطرہ برستی ہے جیسے پھوار
دل کو یاد آگئے عارضِ برگ و بار
لائی بادِ صبا، آج ابرِ بہار
پہلی بارشِ کی خوشبو ہے کشور لیے
چاندنی نے کیا ہے ترا انتظار

شاعری

نظمیں

سلمان حامد

الزائمر(Alzheimer's)

لفظ بھول جاتا ہوں
بات کہہ نہیں پاتا
موتیوں سے پانی پر
عکس تو بناتا ہوں
کچھ میں یاد رکھتا ہوں
کچھ میں بھول جاتا ہوں
روشنی کو تکتا ہوں
تھوڑی دیر چلتا ہوں
تھوڑی دیر رکتا ہوں
دل میں بات جو بھی ہے
تم سے کہہ نہیں پاتا
لفظ بھول جاتا ہوں
پھر یہ سوچ آتی ہے
کہ دل کی بات کرنے کو
لفظ کیوں ضروری ہیں
جو بھی تم کو پڑھنا ہے
سب کچھ لکھا ہے آنکھوں میں
ہو سکے تو پڑھ لینا
پڑھ اگر نہ پاؤ تو
خود سے ہی بنا لینا
پھر ذرا سنبھلتا ہوں
اِک چھڑی پکڑتا ہوں
کھڑکیوں کے پٹنے پر
اک شبیہہ بناتا ہوں
کچھ میں یاد رکھتا ہوں
کچھ میں بھول جاتا ہوں
ان کہی سی باتوں میں
سلسلے پرانے ہیں
کیسے کیسے چہرے ہیں
کیسے دوستانے ہیں
زندگی ذرا سی ہے
مختصر فسانے ہیں
راکھ دل کریدیں تو
دفن کتنی یادیں ہیں
کیسے کیسے چہرے ہیں
قیمتی خزانے ہیں

شاعری

نظمیں

شہباز حسین

کمرہ

بظاہر تم کو لگتا ہے
کہ سب کچھ پاس ہے میرے
نہیں ہمدم
میں سب کچھ چھوڑ آیا ہوں
اسی کچے مکاں کے اوپری کمرے کی دیواروں
سے لپٹی چند تصویروں کے رنگوں میں
جواب تک سانس لیتی ہیں

وہ تحریریں، کتابی اور تنہائی کی باتیں سب
اسی کمرے کے نیلے کارپٹ پر
آج بھی ویسے پڑی ہوں گی
میں جیسے رکھ کے آیا تھا
وہ سگرٹ کا دھواں وہ قہقہے
وہ تاش کے پتے
وہی شطرنج کے مہرے
جو باشندے تھے اس چھوٹی سی دنیا کے
اسی کمرے میں زندہ ہیں
اسی کمرے میں زندہ تھے!

مجذوب

دریا جنگل
جھیل سمندر
برکھا رت اور
ساون بھادوں
سب کچھ میرے اندر ہے
باہر کی دنیا کے منظر سے
کیا لینا دینا میرا
میں تو اپنے اندر سے ہی
باتیں کرتا رہتا ہوں
نظمیں لکھتا رہتا ہوں!

الٹی میٹم

چلو چیزیں سنبھالو سب
قلم، کاغذ، کتابیں، حرف
لمحے، خواب، تعبیریں
تمہارے قہقہے، آنسو، تبسم، سسکیاں
آہیں، خموشی، چیخ
حیرت اور اس میں ڈوبتی راہیں

چلو جلدی سمیٹو سب
تمارے خاک میں ملنے کا موسم آن پہنچا ہے!

شاعری

نظمیں

روحی حیات

خیال کی بنجر زمین

لفظ
کب میرے ذہن کے
سوراخ سے جھانک رہا ہے
جہاں ظلمت قرنوں سے
راج کرتی ہے
اور خیال کے جالے لٹک پڑے ہیں
اوہام کی چمگادڑیں دیواروں سے چپکی ہوئی ہیں
سوچ کے پانی پر کائی جمی ہے
میرے ذہن کے دریچوں میں
کوئی ایسی درز بھی نہیں
جہاں سے ہوا داخل ہو کر
مایوسی کی حبس کو چاٹ لے
اور کوی روزن بھی نہیں
جہاں سے روشنی الہام بن کر اترے
لیکن لفظ کے جگنو نے
اپنی روشنی سے اس میں
سوراخ کر ڈالا ہے
وہ دیکھو.....!!
لفظ دیکھ رہا ہے
لیکن نہیں
وہ تو جا چکا ہے
اور.....
صدیوں سے مقفل خاموشی
کروٹ لے کر پھر سے سو چکی ہے......

گمشدہ نقوش

تم نے
میری آنکھوں کو دیکھا ہے کہیں
وہ اک شب
کسی خواب کے ہمراہ نکلیں تھیں
مگر اب تک نہیں لوٹیں
تم نے
میرے نقوش کو دیکھا ہے کبھی
غبار سے اٹی ایک شام کو
کسی نقاش کی ستواں انگلیوں نے
انھیں ساحل کی ریت پر کریدا تھا
مگر... میرے چہرے پر اترنے سے پیشتر ہی
انھیں سمندر کی کٹیلی موجوں نے نوچ ڈالا
اور.....
وہ مجھے اب تک نہیں ملے!

شاعری

نظمیں

فرحان مشتاق

لمحے کی بات

یہ اس لمحے کی بات ہے
جب آنکھ جھپکنے سے ڈر لگتا
اور اس ڈر میں لپٹی ہوئی
ادھورا ہونے کی خواہش
ٹہلتے ٹہلتے
جھوٹ کی اس دیوار کے پاس پہنچ جاتی
جس کی بنیادوں میں
نوزائیدہ سچ دفن تھے....
تب میں..... خاموشی کے چٹیل میدان میں
تن کے کھڑا ہو جاتا
اور انجانی منزلوں سے آتی ہوئی ہوا
لفظوں کے پیراہن سے.. ایک ایک کر کے
سب رنگ اتارنا شروع کر دیتی
اور تم....
مجھے اپنی طرف دیکھتا دیکھ کر
رونا شروع کر دیتی....اور
مجھے آنکھ کھلنے سے ڈر لگنے لگتا
اور اس ڈر میں لپٹی ہوئی
مکمل ہونے کی خواہش
تمہاری آواز میں شامل ہو جاتی....
جو سرگوشیاں بن کر
میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی
اور میں تمہیں چپ کراتے کراتے
دیوار کی بنیاد میں اُتر جاتا.....!

انجیل صحیفہ

اَن چھوئی کتھا

میں کوئی خواب لکھوں کہانی میں بیتی کسی رات کا
کہکشاؤں کی نگری سے گزرے ہوئے
رات اوڑھے ہوئے اک حسیں ساتھ کا
اس گگن کی کتھا بھی لکھوں
جس پہ نینوں کے جھلمل دیئے جگمگا اٹھے تھے
جس پہ بادل ہماری طرح کھلکھلا اٹھے تھے
جس پہ کہرے کی چادر تلے چاند چپ چاپ تھے
اور کہیں دور مرلی پہ بجتا کوئی ساز تھا
وہ جو خواہش سی بہتی ہوئی کاسنی نہر تھی
وہ جو آنکھوں سے کوسوں پرے ان چھوئی سحر تھی
ہاں وہی، ہاں وہی، ہاں وہی قہر تھی
مجھ کو بانہوں میں اپنی چھپائے ہوئے
برف کی سلوٹوں سے سرکتے ہوئے
دھند اوڑھے ہوئے
چاند کی اوٹ میں
دودھیا روشنی سے پرے
ترے پہلو میں سمٹی ہوئی
رات خاموش تھی
میں بھی میرا کے جیسی کسی کرشن کی یوگنی تھی مگر

شاعری

نظمیں

مصداق اعظمی

ضمیر

تمھیں تمھاری طرح میں سوچوں
تمھاری نظروں سے تم کو دیکھوں
تمھاری خاطر
تمھاری شہ پر
میں مندروں کے کواڑ توڑوں
میں مسجدوں کے مینار توڑوں
تمھاری مے کو
میں آبِ زم زم یا گنگا جل سے
طہور سمجھوں طہور مانوں
تمھاری باتوں کی خامیوں کو
میں اپنی غزلوں میں
جذب کرلوں
تمھاری سازش کو سب کے حق میں
میں سچی ہمدردیوں کا نام دے دوں
اگر یہ سچ مچ ہوا کسی دن
تو یہ بھی سن لے میں کیا کروں گا
اک اپنی دھڑکن کو روکنے سے
تمھارے مرنے کو طے کروں گا

سکون

اپنی غربت کی ایک شب مجھ کو
یاد ہے
کس طرح گذاری تھی
میں نے گیلی زمین پہ سو کر
چاند پانے کی
آرزو کی تھی
جگمگاتے ہوئے
ستاروں میں
اپنے تقدیر کے ستارے کو
ڈھونڈھنے کی ہزار کوشش کی تھی
رات کے کچھ گھنے اندھیرے میں
زلفِ جاناں کی یاد آتے ہی
اپنی تنہائیوں کے
چہرے پر
غازۂ شعر بھی ملا میں نے
جس کی خوشبو فضا میں مہکی تھی
اس مہک کی دبیز چادر سے
سر سے پا تک
چھپایا تھا خود کو
وہ بھی اک دن تھا
اتنی مشکل میں
اپنے پہلو میں اس کے ہونے کے
مجھ کو احساس نے رلایا تھا

افسانہ

محمد طارق

احساس کا قتل

تہذیب یافتہ شہر کی سرحد میں داخل ہونے والی چکنی، شفاف سڑک کے دو کناروں پر دو مختلف بستیاں آباد ہیں۔ایک بستی جسے لوگ مرمر کے بسا رہے ہیں...... قبرستان، ٹھیک اس کے سامنے سڑک کے دوسرے کنارے پر دوسری بستی آباد ہے جہاں لوگ مرمر کے جی رہے ہیں........ جھونپڑپٹّی۔

جھونپڑپٹّی کو شہر کے غلیظ نالے نے ہی کاٹ کر الگ نہیں کیا تھا۔شہر کے مہذب لوگ بھی اس علاقے سے اپنا رشتہ ایسا توڑ چکے تھے جیسے وہ علاقہ شہر کا کینسر ہو۔ ہاں، انتخاب کے دنوں میں سارے لیڈر اپنی ''اونچی ناک'' پر خوشبو میں بسا رومال رکھ کر اس بستی میں ضرور آتے ہیں۔بستی والوں سے برسوں پرانے گھسے پٹے وعدے کرتے ہیں اور زندگی کے خواب دکھا کر چلے جاتے ہیں۔بستی کے لوگ زندگی کے خواب دیکھتے ہوئے ہر روز مرتے رہتے ہیں۔

پچھلے دنوں بستی والوں کو زندگی کے خواب دکھانے والے ایک لیڈر نے قبرستان کی حفاظت کے لیے چار دیواری بنوائی اور اس میں خوب صورت عالی شان آہنی گیٹ بھی لگوا دیا تو بستی والوں کو لگا کہ ان کے علاقے کی رونق بڑھ گئی۔ وہ خوش ہو گئے۔ کچھ لوگ ایک دوسرے کو جانے کس جذبے کے تحت یہ بھی کہنے لگے تھے کہ کسی لیڈر نے بستی والوں کی فکر نہیں کی مگر اس لیڈر نے ہماری موت کے بعد کے گھر کا انتظام تو کر دیا۔ ہماری زندگیاں بھلے ہی غیر محفوظ علاقے میں گزر رہی ہیں۔مگر مرنے کے بعد چار دیواری سے گھرا عالی شان گیٹ والا ہے ہمارا محفوظ قبرستان!

اسی محفوظ قبرستان کی ایک انتہائی خوفناک رات گہری سیاہ اور پر اسرار آسمان ستارے گویا سہمے ہوئے تھے۔ ہوائیں ساکت تھیں اور جھینگروں کے راگ نے ماحول میں خوفزدہ ارتعاش پیدا کر رکھا تھا۔

رات کے تقریباً دو بجے ہوں گے قبرستان میں رات کے سنّاٹے کو چیرتی ہوئی دہشت ناک چیخ ابھری ''بچاؤ...... بچاؤ، بھوت، بھوت، بچاؤ...... بچاؤ!

چیخ سے پہلے قبرستان کے گیٹ سے پائپ نما روشنی لہراتی ہوئی باہر آئی اور اس کے پیچھے ایک شخص ہاتھ میں جلتی ہوئی ٹارچ لیے بدحواسی کے عالم میں دوڑتا ہوا گیٹ سے نکلا اور انتہائی تیز رفتاری سے سڑک پار کر کے جھونپڑ پٹّی کی گلیوں میں روپوش ہو گیا۔ جھونپڑ پٹّی کے بھونکتے ہوئے کتے یکلخت خاموش ہو گئے۔جھینگروں کی آواز بند ہو گئی۔ ہیبت ناک سناٹا چاروں طرف پھیل گیا۔ اسی سنّاٹے میں قبرستان سے عجیب ڈراونی آوازیں آنے لگیں جیسے ہڈیاں چیخ رہی ہوں۔ جیسے سوکھی لکڑیاں ٹوٹ رہی ہی ہوں ہولے ہولے آواز گیٹ کے قریب آ گئی اور پھر قبرستان کے گیٹ پر ایک لاش کفن میں لپٹی کھڑی تھی۔

وہ ایک عورت کی لاش تھی....... وہ لاش تھی یا کفن میں لپٹی ہوئی زندہ عورت؟ اس کے لمبے بال شانوں پر بکھر کر کمر پر جھول رہے تھے آنکھیں وحشت سے پھٹی ہوئی تھیں چہرہ خوفزدہ تھا۔

وہ دھیرے دھیرے قبرستان کے گیٹ سے نکل کر سڑک پر آئی۔ شہر میں جاتی ہوئی سیاہ سڑک کو دور تک دیکھا۔ پھر ہولے ہولے قدموں سے سڑک پار کر کے جھونپڑپٹّی میں گھس گئی اور کچے اور بڑ کھابڑ راستے پر چلتے ہوئے ایک جھونپڑے کے زنگ

آلو ڈبین کے دروازے کے سامنے رُک گئی۔

وہ جھونپڑا ''ابّو'' حمال کا تھا ''ابّو'' کا نام اس کے باپ نے عبدالعزیز رکھا تھا۔لیکن وہ عبدالعزیز نہ رہا جس طرح اس کا باپ عبدالکلام ''کلّو'' حمال کے نام سے جاتا تھا۔وہی حشر سماج نے عبدالعزیز کے نام سے بھی کیا تھا۔مفلسی کے ساتھ بگڑے نام کی شناخت اسے وراثت میں ملی تھی جسے اس نے نام کے لیے جینے اور مرنے والے سماج میں وراثتی حق کی طرح قبول کر لیا تھا۔مفلسی انسان کو کتنا بے بس کر دیتی ہے!

ابّو حمال کے ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی۔لڑکا سجّاد جس کا نام ''سجّو'' ہو گیا تھا۔وہ اپنے باپ کے ساتھ حمالی کیا کرتا تھا لڑکی سلمٰی جسے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے دو سال بیت چکے تھے۔ان دو سالوں میں وہ بار ہا سستے قسم کا پاؤڈر چہرے پر لگا کر، آنکھوں میں ترچھا کا جل کھینچ کر اور زلفوں کو سنوار کر زنگ آلو ڈبین کا دروازہ کھول کر کھڑی رہتی تھی لیکن ابّو حمال کے گھر کبھی کوئی پتھر نہیں آیا تھا کیوں کہ وہ پھل دار درخت نہیں بن پایا تھا اور سلمٰی رفتہ رفتہ باپ کے سینے پر ایک چٹان بن گئی تھی۔

اچانک ایک دن چٹان لڑھک گئی۔ابّو حمال دھاڑیں مار کر رویا۔اس کی بیوی نے سینہ پیٹا اور سجّو کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں تھیں۔

سجّو اپنی بہن کو بے حد چاہتا تھا۔اس نے اپنی شادی کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا کہتا تھا ''جب تک میں اپنی بہن کے ہاتھ پیلے نہ کر دوں شادی نہیں کروں گا''

سلمٰی کے ہاتھ پیلے تو نہیں ہوئے۔ اسے پیلیا (یرقان) ہو گیا سرکاری اسپتال کی دوائیاں کھا کر فائدہ نہیں ہوا۔ معیاری ڈگریاں والے اسپیشل ڈاکٹروں کا مہنگا علاج روز کنواں کھودنے، روز پانی پینے والے ابّو حمال کے لیے ممکن نہیں تھا۔

ایک دن کھڑے کھڑے سلمٰی کو چکر آیا وہ جھونپڑے کی پتھریلی زمین پر گر پڑی سجّو دوڑا دوڑا جھونپڑ پٹی کے ڈاکٹر کے پاس گیا......ڈاکٹر آیا سلمٰی کی نبض دیکھی۔Stethoscope سے دل کی دھڑکن کا معائنہ کیا۔آنکھیں چیریں اور پھر افسوس کا ناٹک کر کے سلمٰی کے چہرے پر میلی چادر ڈھانپ کر چل دیا۔

گھر میں کہرام مچ گیا......

شام چھ بجے سلمٰی کی تجہیز تکفین کر دی گئی تقریباً ساڑھے آٹھ گھنٹے بعد رات ڈھائی بجے جھونپڑے کے دروازے پر دستک ہوئی۔کتوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

دستک کی آواز بڑھتی گئی......

سلمٰی کے ماں باپ کو جوان بیٹی کے غم نے سونے نہیں دیا تھا اور اس کا بھائی بھی بہن کی موت کا درد سینے میں دبائے جھونپڑے کی شکستہ چھت کو تک رہا تھا جس پر جا بجا مکڑی کے مٹیالے جالے لٹک رہے تھے۔

دستک کی آواز سن کر تینوں اپنے اپنے بستروں سے اٹھ بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کا چہرہ سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔''کون ہوگا اتنی رات گئے؟'' ابّو نے بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا۔

''دیکھتا ہوں!'' سجّو اٹھ کر دروازے کی طرف گیا۔

جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا اس کا سارا وجود کانپ اٹھا۔اس کی گھگھی بند گئی۔بے محابا وہ الٹے پاؤں جھونپڑے میں گھس گیا اور لرزتے لہجے میں کہنے لگا بھوت...... سلمٰی کا بھوت....ابّا! وہ......وہ!''

ابھی اس کا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ کفن میں لپٹی سلمٰی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

سلمٰی کو دیکھ کر تینوں حواس باختہ ہو گئے۔ پھٹی پھٹی بے جنبش آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے۔ ان پر جیسے بجلی گر چکی تھی۔ پُر اسرار خوف سے ان کے چہروں کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ ماتھے پر پسینے کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ لبوں پر ہیبت کے قفل لگ چکے تھے۔

''ڈرو مت! میں بھوت نہیں ہوں، سلمٰی ہوں! تمہاری سلمٰی! آپ لوگوں نے مجھے زندہ دفن کر دیا تھا۔'' سلمٰی نے تھر تھرائے لبوں سے کہا اور ایک قدم آگے بڑھی۔

ماں، باپ بھائی خوف سے سمٹ گئے ان کی بھوئیں ماتھے پر چڑھ گئی تھیں شکنوں کا جال تینوں کی پیشانیوں پر تن گیا تھا وہ آنکھیں پھاڑے منہ کھولے سلمٰی کو تک رہے تھے۔

''میں زندہ ہوں، دیکھو مجھے! میں زندہ ہوں! سلمٰی تینوں کے بالکل پاس پہنچ گئی۔

''تم قبر سے کیسی نکلی! باپ نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ باپ کی آواز میں خوف کی لرزش بھی تھی۔

جواب میں سلمٰی نے جو انہیں بتایا اسے سن کر ماں، باپ اور ان کا بھائی ہکا بکا رہ گئے۔ ان کے چہروں کا رنگ اُڑ گیا۔ انہیں سلمٰی کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اور سلمٰی ان کے سامنے رو رہی تھی۔

''میں نے جو کچھ بتایا..... وہ سچ ہے!''

''ہاں..... میری بیٹی!'' ''تم جھوٹ تھوڑی کہو گی!''

بے اختیار ماں نے روتی ہوئی سلمٰی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا باپ نے کپکپاتا ہاتھ اس کے سر پر رکھا

''رو مت میری بیٹی! کفن اتار لے، کپڑے بدل لے، صبح پولیس تھانے میں رپورٹ کریں گے!''

باپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بیٹی کو پانے کی خوشی منائے یا ماتم کرے۔

''رپورٹ کرنے سے ہماری بدنامی ہو جائے گی!''

سلمٰی کی ماں کے لہجے میں خوف جھلک رہا تھا۔

''بدنامی کے ڈر سے کیا ہم وہ سب خاموش سہہ لیں جو سلمٰی کے ساتھ ہوا؟'' سلمٰی کا بھائی ایسا بھڑکا جیسے اس کے اندر جوالا مکھی پھٹ پڑا ہو۔ ''ہم رپورٹ کریں گے..... کیوں ابّا!'' سجّو باپ کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھ کر سخت لہجے میں بولا۔

''ہاں.....!'' ابّو کے سینے میں بھی آگ لگی ہوئی تھی۔

اس آگ کی لپٹیں ابّو کے مونہہ سے نکلیں ''اپن صبح سلمٰی کو تھانے لے جائیں گے اور رپورٹ کریں گے۔''

صبح ابّو اور سجّو سلمٰی کو لے کر تھانے پہنچے۔ رپورٹ لکھوائی..... لکھنے والا قلم روک کر سلمٰی کو دیکھتا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے تاثرات پیدا ہوتے۔ مٹتے۔ لکھتے لکھتے اس کا قلم کانپ جاتا اور وہ خود بھی اندر تک لرز جاتا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا جو کچھ سلمٰی کہہ رہی تھی۔

تھانے دار بھی سلمٰی کا بیان سن کر دم بخود ہو گیا تھا۔ سلمٰی رو رہی تھی۔ ''میں نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے تھانے دار صاحب! وہ سچ ہے!''

سلمٰی کا بیان قلم بند کرنے کے بعد تھانے دار نے سلمٰی کو میڈیکل جانچ کے لیے لیڈی کانسٹبل کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ اور کچھ پولیس والوں کو مجرم کی تلاش کے لیے بھیج دیا۔

..... میڈیکل جانچ کی رپورٹ سے سلمٰی کے بیان کی تصدیق ہو چکی تھی۔

تھوڑی مشقت کے بعد مجرم کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مجرم گورکن تھا کالا کلوٹا، دبلا پتلا، اس کے سوکھے ہوئے چہرے پر ڈاڑھی اور مونچھوں کی کھونٹیاں پھیلی ہوئی تھیں سر کے بال بے ترتیب اور گرد آلود تھے پیشانی کے اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں

سفا کی تھی موٹے، سیاہ لبوں سے جھانکتے ہوئے زرد دانتوں نے اس کے چہرے کو اور ہیبت ناک بنا دیا تھا۔

تھانے دار اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا اور وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

’’کیوں رے!‘‘ تھانے دار کی گرج دار آواز کے کانوں سے ٹکرائی۔

اس نے خوفزدہ نگاہوں سے تھانے دار کو دیکھا۔ تھانے دار کرسی کے ہتھوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کی پوزیشن میں تھوڑا کھڑا ہی ہوا تھا کہ گورکن سرتاپا لرز گیا۔ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا ’’صاحب! مجھے مت مارو؟ میں سب سچ سچ بتا دیتا ہوں۔ مار سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے!‘‘

’’بتا...... پہچانتا ہے تو اس لڑکی کو؟‘‘

کیبن سے دور برآمدے میں باپ اور بھائی کے درمیان بینچ پر بیٹھی ہوئی سلمیٰ کی طرف تھانے دار نے اشارہ کر کے پوچھا۔ گورکن نے لڑکی کی طرف دیکھا ’’ہاں....!‘‘

’’کیا نام ہے؟‘‘

’’نام نہیں جانتا میں کل رات اس کی قبر میں گھسا تھا........‘‘

’’کیسے؟‘‘

’’قبر کو پائنتی کی طرف سے کھول کر‘‘

’’کیوں‘‘

گورکن چند لمحے خاموش رہا اور پھر ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا ’’مجھے مارنا مت صاحب! میں سب سچ سچ بتاتا ہوں مار سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔

’’بتا..... سچ سچ بتا کیوں گھسا تھا قبر میں!‘‘ تھانے دار دہاڑا۔

گورکن نے سپاٹ لہجے میں سب سچ سچ بتا دیا جسے سن کر تھانے دار کا سر آتش فشاں بن گیا اس کا سارا بدن دہک اٹھا شریانوں میں لہو گرم سیال کی طرح بہنے لگا..... اور اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

حرامی..... کمینے...... نیچ....... دانت پیس کے تھانے دار نے اسے وہ ساری مغلظ گالیاں دے ڈالیں اور پھر نہایت حقارت سے اس کی طرف دیکھ کر ہانپتے ہوئے بولا ’’حرامی! تیرے لیے میرے پاس اب کوئی گالی نہیں جو تجھے دے سکوں! اور پھر گورکن کو ایک ایسا زناٹے دار طمانچہ رسید کیا کہ وہ فرش پر گر پڑا اس کے منہ سے خون بہنے لگا......

دور آسمان پر ’’ایشر سنگھ‘‘ (منٹو کا افسانہ ٹھنڈا گوشت کا کردار) منٹو سے کہہ رہا تھا۔

’’منٹو جی! دیکھو دنیا کہاں پہنچ گئی جس احساس نے مجھے مار ڈالا تھا آج آدمی نے اس احساس کا ہی قتل کر دیا ہے۔‘‘

شرح

دیوانِ غالب

شارح

سید محمد ضامن کنتوری

مرتبہ

اشرف رفیع

قیمت: -/1200 روپے

-/800 طلباء ایڈیشن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

www.ephbooks.com

ناصر راہی

افسانہ

رات کا آخری پہر

اکثر ہم رات کا کھانا کچن میں کھاتے یا ڈائننگ ہال میں۔ ہمارا کچن کشادہ اور ہوادار تھا اس لیے وہاں مجھے بیٹھتے ہوئے کسی طرح کی کوفت محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن اس روز کیا ہوا کہ نیچے دستر خوان پر نہ بیٹھ کر کچن میں پڑی کرسی پر میں جا بیٹھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کا کوئی پایہ لپلپا کر ٹوٹ گیا تھا۔

مچھلی کے شوربا سے بھرا پیالہ میرے ایک ہاتھ میں تھا جس کی گہرائی میں قتلے کی ایک تکونی سی منڈی ڈوبی پڑی تھی۔ سچ پوچھیے تو دریاؤں کی مچھلی پر میں اپنی جان دیتا تھا۔ اس کا پرروغن مغز میرے منہ کے ذائقے کو دوبالا کر دیتا تھا۔ مگر اس کے چھوٹے چھوٹے دائروں سے سرخی مائل دیدے مجھے کبھی نہیں پسند آئے تھے۔ بس یوں سمجھ لیجیے سرخ وسیاہ رنگ کی بے جوڑ ہم آہنگی سے مجھے ایک طرح کی ہیبت کا احساس ہوتا تھا اور جب میں اس ہیبت کو اپنی ذات میں چھپانے کی کوشش کرنے لگتا تو خود میرے اندر کا وحشی میرے شانے جھنجھوڑ کر مجھے بزدلی کے طعنے دینے لگتا، جب میں خود کو بے طرح لہولہان پاتا۔

میری پسند اور ناپسند کا خیال رکھتے ہوئے میری بیوی مچھلی کو ہلدی نمک پانی میں بڑے قاعدے سے دھوتی، منڈی سے پیوستہ اس کے دیدوں کو اپنی نازک انگلیوں کو ٹیڑھا کر باہر کھینچ لیتی اور آنگن کے ایک کونے میں ڈال دیا کرتی، انہیں دیکھ کر پرندے نیچے اتر آتے تھے۔

میں ہرگز نہیں گرتا، یہ میرا خیال تھا۔ مگر میں جب گرا تو پیالہ کے اندر کا شوربا اور تکونی منڈی کا ایک تہائی حصہ دونوں فرش پر یوں بکھر گئے تھے، جیسے کسی نوزائیدہ بچے کا کچلا ہوا سر اور اس کے خون کے چھینٹے ہوں۔ ایسے میں میری بیوی منہ میں نوالہ لیے چیخی تھی۔

میں نے اسے اس وقت ڈانٹ دیا تھا۔ ''احمق عورت، چیخی کیوں تھی؟''

اصل میں مجھے وہ بے خانماں برباد لوگ یاد آ گئے تھے جن میں زیادہ تر بچے بوڑھے، جوان اور معمر عورتیں شامل تھیں۔ جو اپنی جانیں بچانے کی خاطر اجنبی سے راستوں میں بھاگے جا رہے تھے۔ ان راستوں کی اوٹ میں حکومت کے بے داد گران بچوں بوڑھوں کو ہانکتے ہوئے ایک طرف کہیں دور لیے جا رہے تھے اور بعضے وہاں چمچماتی مچھلیوں کے سیم تن سے کھیل رہے تھے۔

ان بے داد گروں کے ساتھ عنابی لباس میں ملبوس کچھ نوعمر لڑکے تھے، جن کے ہاتھوں نے بڑے بڑے کاسہ تھام رکھے تھے جن میں کئی پھٹی آنکھیں اور خون سنی پتلیاں تھیں۔

یہ سب سوچتے ہوئے مجھے جانے کیوں ایسا محسوس ہوا کہ میں کہیں چکرا کر گر نہیں جاؤں۔ تبھی کرسی کا جو کمزور پایہ تھا لپلپا کر ٹوٹ گیا تھا۔ اس وقت مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میری آٹھ سالہ بچی جو مجھ سے پہلے کھا چکی تھی اور نیند کے غلبہ کی وجہ سے اپنے گھنے بالوں والا سر میری جانگھ پر رکھے سو رہی تھی، وہ بھی میری طرح ہی فرش پر گری تھی۔ کچھ خوابیدہ مگر چوندھیائی ہوئی نگاہوں سے وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ لیکن میرے ہاتھ پاؤں تو خود ہی فرش پر چھترائے پڑے تھے۔ میں اٹھنا چاہ رہا تھا، میری طرف بیوی کے ہاتھ بھی بڑھے تھے۔ یہ کہہ کر میں نے اسے منع کیا کہ تمہاری ریڑھ کی ہڈی پہلے ہی سے کمزور ہے۔ پھر میں نے اپنا داہنا ہاتھ اپنے بارہ سالہ لڑکے کی طرف بڑھایا کہ ذرا سا سہارا ملے تو میں اٹھ کر کھڑا ہو جاؤں۔ نہ جانے کیوں وہ مجھے ذہن سے کچھ خالی خالی سا لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں خود ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بیوی سے کہا۔ ''تم بچوں کو لے کر

بستر پر جاؤ، میں کپڑے تبدیل کر آتا ہوں۔''

میں کپڑے بدل کر بیوی کے بغل میں آلیٹا۔ میں نے سرگوشی کی سی آواز میں دریافت کیا۔'' بچے سو گئے؟''

''ہاں، یہ نیند کے ماتے اپنے ننھے ننھے گھوڑوں پر سوار خوابوں کے ان محلوں کی طرف نکل گئے جہاں جھروکوں سے لگے کھلونے ان کی راہ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔'' اتنا کہتے ہوئے بیوی نے میری طرح اپنا رخ کیا اور میرے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی بولی۔''تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟''

''نہیں!'' میں نے قدرے اطمینان سے جواب دیا۔

''ایک بات کہوں؟''

''ہاں کہو۔''

''آپ مانس مچھلی کھانا کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔''

''چھوڑ دوں، مگر کیوں؟''

''مانس تو اب فتنہ انگیز ہو گیا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''دیکھ ہی رہے ہیں نا۔ آئے دن لوگ جانور کے ساتھ پکڑے اور مارے جا رہے ہیں۔ خوف اور دہشت کے اس ماحول میں کہیں کوئی آواز بھی اٹھاتا ہے کہ دیر نہیں لگتی وہ مار دیا جاتا ہے جبکہ مجھے اچھی طرح پتہ ہے۔''

''تمہیں کیا پتہ ہے، بتاؤ تو سہی۔''

''گنگا پوری ہنے کے ناطے مجھے سب پتہ ہے۔ میں نے اکثر لوگوں کو اپنے مرے ہوئے جانوروں کو دریا برد کرتے دیکھا ہے۔ کیا گائے کیا سور۔ ان کے گلے سڑے جسموں کے ریزوں کو سوائے مچھلیوں کے اور کون کھاتا ہے۔ وہی تو ہیں جو سارا کا سارا چٹ جاتی ہیں۔ پھر کھانے والے سے کون جائے پوچھنے کہ صاحب آپ نے کیا نوش جان کیا ہے؟''

اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ہمیں نیند کی وادیوں میں اتر جانے کی عادت تھی، سو ہم اتر گئے۔

غالباً رات کا کوئی پہر تھا۔ شاید رات کا آخری پہر ہی ہوگا وہ۔ کسی نے جب ہمارا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔ ہاں کسی نے دروازے پر زوردار دستک دی تھی۔ میں نیند سے اٹھ بیٹھا اور مارے خوف کے دل سینے سے آلگا تھا۔ کمرے میں دھڑکنوں کی آواز صاف سنائی دینے لگی تھی۔

ہم نیند آلود اور دہشت زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ میرے دونوں بچے اپنی ماں سے چمٹے ہوئے تھے۔''

''اتنی رات گئے آخر کون ہو سکتا ہے.... کال بیل نہ بجا کر دروازے پر دستک دے رہا ہے؟''

''پولس والے.... لیکن ان کا ہمارے گھر کیا کام؟''

''میں جا کر دیکھتا ہوں کہ باہر کون ہے۔'' میں نے اپنی سراسیمگی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو باہر نہ جانے دوں گی۔''

''پاگل ہو گئی ہو؟.... جا کر دیکھنے میں ہرج ہی کیا ہے؟'' یہ کہتے ہوئے میں نے کمرے کا بلب آن کر دیا۔

''ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔''

بادل نخواستہ ہم دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ باہر لیمپ پوسٹ کی روشنی میں میں نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر پر وقار لباس میں اس وجیہ شخص کو دیکھا جو ہمارے روبرو دروازے پر کھڑا ہمیں ڈاکٹر کے سے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے اور بھی کچھ لوگ تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک گہرا چوکور نما بکس تھا۔ ان سے بھی ذرا اوٹ میں مجھے چند رائفل بردار سایے نظر آئے۔ آخر یہ رائفل بردار سایے ان کے محافظ تھے یا کوئی اور..... میں نے جب اس پر وقار لباس والے شخص سے استفسار کیا کہ'' آپ لوگوں کے آنے کا سبب، وہ بھی اتنی رات گئے، کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ سب کون ہیں اور کیوں.....''

''کیوں نہیں!'' پُروقار لباس والا آدمی بولا۔ ''اصل میں ہم لوگ محکمہ حفظانِ صحت سے ہیں اور حکم شاہی کے مطابق ہی آپ کے یہاں آنا ہوا....کیا آپ کا مکان نمبر ٹو بائی ٹو اے (2/2-A) ہے؟''

''ہاں۔''

''آپ کے مکان میں کل چار افراد ہیں۔''

''ہاں مگر کیوں؟''

''حکم شاہی کے مطابق ہمارا آدمی ڈراپ پلانے پر مامور ہے۔''

''پھر بھی یہ سب کیوں اور کس لیے جب کہ ہم میں سے نہ کوئی بیمار ہے اور نہ ہمیں اس کی ضرورت ہے....اور پھر....پھر اس مخلوط آبادی میں ہم ہی کیوں؟''

وہ پُروقار لباس والا آدمی، جو بظاہر ڈاکٹر نظر آ رہا تھا اور ان کی نمائندگی کر رہا تھا، کچھ برہم ہو کر بولا۔ ''تو شاید تم لوگوں کو خبر نہیں کہ ایک بہت ہی خطرناک بیماری ''ہائی لے کیونا'' ہمارے بھارت ورش میں چلی آئی ہے۔ بے حد خطرناک اور موت کی حد تک جان لیوا....اس کے فوری سدباب کے لیے ہم لوگ ڈراپ پلانے پر مامور کیے گئے ہیں۔''

''اور ہم نے ڈراپ لینے سے انکار کیا تو؟''

''جب بھی ہم شاہی فرمان کے مطابق ہی اپنے کام کو انجام دیں گے۔''

اتنے میں ہم نے دیکھا دور اوٹ میں سے چل کر چند رائفل بردار سایے ہماری طرف آ گئے اور ہم پر سنگین تان کر کھڑے ہو گئے۔ موت کی سی خاموش رات میں ان کے حکم پر عمل کرنے کے سوا ہمارے پاس اب اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ڈراپ لینے سے انکار گویا اپنی کھلی موت کا اعلان تھا۔

فہرست میں درج نام اور عمر کے مطابق ہمیں باری باری سے ڈراپ دیے گئے جنہیں ہم اپنے حلقوم کے اندر اتارنے پر مجبور تھے۔

''شاباش، شاباش!....اب تم سب اپنے کمرے میں جا سکتے ہو۔'' وہ لوگ ایک ایک کر کے ہمیں اندر ہانک رہے تھے۔ لیکن میں اپنا ہیبت ناک منہ پھاڑے وہاں کھڑا تھا۔ تو کیا میں انسان نما کوئی وحشی بھیڑیا تھا یا وہ لوگ تھے جو ابھی ابھی ہمیں ڈراپ پلا کر اپنی اپنی گاڑیوں سے دور نکل گئے تھے۔

بڑی ناطاقتی سے چلتا ہوا میں کمرے کے اندر آیا۔ بستر تک ابھی پہنچا بھی نہ تھا، یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا کہ میری بیوی، بچے فرش پر اوندھے پڑے تھے۔ ان کے منھ اور نتھنوں سے خون رس رہا تھا۔ میں نے شاید انہیں جھنجھوڑا اور پکارا تھا۔ مگر دوا کے زیر اثر مجھے یہ پتہ نہ چل سکا کہ میں ان کے لیے کچھ کر سکا بھی یا نہیں کیونکہ میرے پاؤں کسی بڑے آتش دان میں پڑ گئے تھے یا میرے سر پر دہکتا ہوا سورج آ گیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا میں نہیں دیکھ سکا تھا۔ آنکھوں میں کبھی نہ ختم ہونے والا اندھیرا اتر آیا تھا اور ان اندھیروں سے میرا راوی اسی وقت باہر نکل آیا اور ان کے پیچھے ہو لیا تھا۔

☆☆☆

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو کا رسالہ ہے۔
جس کو کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی
اعزازی کاپی طلب فرما کر ہمیں
شرمندہ نہ کیجیے۔

تبسم زہرا

افسانہ

آخری منزل

سہ روزہ قومی سیمینار کا دوسرا دن بھی اختتام پذیر تھا، ریسرچ اسکالر تانیا کھانا کھاتے ہوئے لوگوں کا نظارہ کر رہی تھی کہ اچانک اس کی نظریں اسی شعبے کی صدر پروفیسر رینا ملک اور کانپور سے آئے ہوئے پروفیسر دیویندر ترپاٹھی پر ٹھہر گئیں۔ جو تقریباً آدھی زندگی مکمل کر چکے تھے۔ یہ دونوں ہال کے ایک نیم تاریک گوشے میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے تھے اور دونوں کی ٹانگیں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئیں تھیں۔ اس منظر کو دیکھ کر تانیا سناٹے میں آ گئی, اسے ایک بے چینی سی محسوس ہونے لگی، مگر اس نے بہت جلد اپنے اوپر قابو پا لیا اور خواب و خیال کی اس دنیا سے اس وقت خود کو پوری طرح باہر نکال لیا، جب ہال میں کسی کی آواز گونجی "Hello, Reena.how are you?"

پروفیسر رینا ملک اس آواز کو سن کر چونک پڑیں وہ دونوں ہاتھوں کو میز پر ٹکاتے ہوئے اپنے پیر کو ایک ہلکے جھٹکے سے کھینچ کر کھڑی ہو گئیں اور جدھر سے آواز آئی تھی ادھر کا رُخ کر کے دیکھنے لگیں۔ انھیں ہوا میں ایک ہاتھ لہراتا ہوا نظر آیا۔ مگر وہ اسے پہچان نہ سکیں۔ لیکن جیسے ہی ممتا ان کے قریب آئی، انھوں نے اسے پہچان لیا اور آگے بڑھ کر اسے گلے لگاتی ہوئی بولیں،

''یار تو نے تو مجھے ڈرا دیا اور میرے دل کی دھڑکن تیز کر دی'' انھوں نے ممتا کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ممتا تجھے دیکھتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کی یہ کون مرد ہے جو مجھے جانتا ہے تو قریب آئی تو میں نے پہچانا، تو تو آج تک ویسے ہی مردوں والا وضع اختیار کیے ہوئے ہے، تو ذرا بھی نہیں بدلی۔ آج بھی تجھے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تو عورت ہے۔ لیکن بہت اچھا ہے کہ آج عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ تو چل ہی رہیں ہیں اگر گیٹ اپ بھی ویسا ہی اختیار کر لیا تو کیا غلط ہے''

''اچھا یار چل چھوڑ، یہ بتا کیسی ہے اور کیا ہو رہا ہے؟'' ممتا نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا

''یار بس کچھ خاص زندگی نہیں گزر رہی ہے، تو تو جانتی ہے میرے شوہر کے شکّی مزاج کو، اسی لیے ہماری آج تک نہیں بنی، یار اگر بچے نہ ہوتے تو میں کبھی کی الگ ہو چکی ہوتی''

پھر پروفیسر رینا ملک پروفیسر ترپاٹھی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولیں

''ممتا اِن سے ملو۔ یہ پروفیسر ترپاٹھی ہیں جو ایک اچھے فکشن نگار ہیں اور حال ہی میں ان کا ایک مشہور ناول منظرِ عام پر آیا ہے جو آج کے دور کی اچھی نمایندگی کرتا ہے''

فوراً ممتا اخلاقاً کرُسی پر سے اٹھی اور ان کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"Hello Professor. Nice to Meet You"

"Thank You So Much" ممتا مجھے بھی آپ سے مل کر اچھا لگا'' پروفیسر ترپاٹھی نے بھی کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی اور ہاتھ ملا کر دونوں بیٹھ گیے۔

اتنے میں رینا ملک، دیویندر ترپاٹھی سے مخاطب ہو کر بولیں

''پروفیسر ترپاٹھی یہ میری بچپن کی دوست ہے جس نے ہمیشہ آزادانہ زندگی گزاری ہے اور ہمیشہ شادی کی مخالف رہی اور آج شہر کے مشہور جرنلسٹوں میں اس کا شمار ہوتا ہے''

دیویندر ترپاٹھی کے تاثر سے بھرے چہرے کو دیکھتے ہوئے، ممتا بول پڑی ''ارے یار میں تو ایک معمولی سی نوکری کرتی ہوں۔ اسِ کو تو شروع سے ہی باتیں بنانے کی عادت رہی ہے''

اتنے میں پروفیسر ترپاٹھی بول پڑے''اچھا آپ شادی کی مخالف کیوں ہیں؟''

ممتا کچھ سوچتے ہوئے اور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چابی لیتے ہوئے بولی

'' شادی وادی، سب فضول ہے، شادی کر کے قید ہونے کی کیا ضرورت ہے، اکیلے رہ کر آزادانہ زندگی گزارنے میں جو مزا ہے وہ مزا اور کہاں، اب ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں، پھر شوہر کے کہنے پر چلو، نہ چلو تو گھر میں لڑائی جھگڑے اور اگر بچے ہو جائیے تو پھر تو تمھارا ایشور ہی مالک ہے کہ پھر چاہتے ہوئے بھی الگ ہونا بڑا مشکل ہو جاتا ہے میری ماں نے پینتس سال پتی کے ساتھ بڑی مشکل سے گزارے ہیں۔ وہ پہلے کی دقیانوسی سوچ کی مالک تھیں۔ مگر پھر جب میں کمانے لگی تو میں نے انھیں سمجھایا اور آج کل وہ میرے ساتھ رہ رہیں ہیں۔شادی کر کے کون خوش رہتا ہے۔اب اس کا ہی دیکھ لو، جب سے شادی ہوئی ہے پریشان ہے''ممتا نے پروفیسر رینا ملک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پروفیسر ترپاٹھی وقت بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔اب شادی ضروری نہیں ہے بلکہ لوگ کامیابی کے پیچھے ہیں اور شادی جس مقصد کے لیے کی جاتی ہے وہ تو لوگ وقت سے پہلے ہی حاصل کر لیتے ہیں۔

''I Agree''پروفیسر ترپاٹھی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا

''اور ویسے بھی میں تو پہلے سے ہی Marrige Material نہیں تھی۔اسی لیے میں نے سوچ لیا تھا کہ شادی نہیں کروں گی اور اب تو فطرتاً اٹھنے والی خواہش بھی پیدا نہیں ہوتی ''ممتا نے بتاتے ہوئے کہا

وہ دونوں ممتا کو غور سے دیکھنے لگ گئے،ان کے چہروں پر حیرت تھی پھر ایک گہری خاموشی چھا گئی

اتنے میں ہال کے تمام لوگ کھانا کھا کر باہر نکلنے لگے اور یہ تینوں اسی نیم تاریک گوشے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے، پھر خاموشی چھا گئی ایک گہری خاموشی،

اب رات بھیگ چلی تھی اور تاریکی نے پوری طرح ڈیرا جما لیا ہے۔ یہ تینوں ایک ساتھ باہر نکلے۔

ممتا اپنی اسکوٹی سنبھالے ہوئے آگے بڑھ گئی اور رینا ملک دیویندر ترپاٹھی کی کار میں بیٹھ کر ہوٹل کی سمت مڑتے ہوئے تاریکی میں گم ہو گیے۔تانیا بھی اسکوٹی پر بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

جب تانیا گھر پہنچی تو رات کے آٹھ بجے تھے۔اس نے کپڑے تبدیل کیے اور لیٹ کر خیالات کی دنیا میں گم ہو گئی۔سوچ کے دائرے اس کے اردگرد پھیل چکے تھے۔

پروفیسر رینا ملک اور پروفیسر ترپاٹھی جس انداز میں بیٹھے تھے۔وہ اسے بھول نہیں پا رہی تھی عجیب سے خیالات اس کے وجود پر حاوی ہو رہے تھے جس سے اسے ایک بے چینی کا احساس ہو رہا تھا۔اس نے ان خیالات سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی، مگر خیالات تھے کہ ڈیرا جمائے اس کے ذہن میں بس چکے تھے۔ وہ ان تصویروں سے چھٹکارا پانے کے لیے اٹھی اور منھ پر پانی کے چار پانچ چھپاکے مارتے ہوئے سیدھی کھڑی ہو گئی، یکایک اس کی نظریں سامنے آئینے پر پڑیں تو اسے اپنا عکس نظر آیا۔اس نے چہرہ آگے بڑھایا اور اپنے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔اسے محسوس ہوا کہ اس کے اندر کچھ تبدیلی آ رہی ہے۔ وہ سوچ کی دنیا میں اب بھی گم تھی اسے یاد آیا کہ اس کے والد بھی اس کو پروفیسر بنانا چاہتے ہیں، لیکن اگر آج وہ یہ سب کچھ دیکھ لیتے اور ان کی باتیں سن لیتے تو شاید وہ اپنا ارادہ بدل دیتے، اور یہی نہیں وہ میری تعلیم بھی روک دیتے اور اسے ملی ہوئی تھوڑی سی آزادی بھی چھن جاتی

اچانک تانیا کو خیال آیا، کی کیا سبھی پروفیسروں کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے؟ نہیں سب ایک جیسے نہیں ہوتے یہی سب سوچتے سوچتے وہ ایک گہری نیند میں ڈوب گئی۔

آج سیمینار کا تیسرا اور آخری دن تھا۔ کالج پہنچ کر اسے کچھ تیاریاں کرنی تھیں۔ مگر جیسے ہی اس نے شعبے میں قدم رکھا وہ ایک دم چونک گئی اس کے خیالات کی دنیا پھر سے ذہن کے پردے پر ابھر آئی اس کے سامنے رینا ملک اور پروفیسر ترپاٹھی بیٹھے ہوئے تھے نہ جانے کیوں وہ قدرے جھینپ گئی پھر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی

"Good Morning sir"

"Good Morning" دونوں نے جواب دیا پھر رینا ملک پروفیسر ترپاٹھی کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں

''پروفیسر ترپاٹھی یہ تانیا ہے میرے انڈر میں ریسرچ کر رہی ہے اور ہمارے شعبے کی Brilliant Student ہے آج کل اسے پڑھانے کے لیے کچھ کلاسیز بھی دی گئی ہیں''

پروفیسر ترپاٹھی نے تانیا کو دیکھتے ہوئے کہا

''اچھا، آپ کا ریسرچ ٹاپک کیا ہے''

''میں فکشن پر کام کر رہی ہوں'' تانیا نے جواب دیا۔

پھر پروفیسر ترپاٹھی کچھ اور سوال کر کے رینا ملک سے بولے۔

''رینا جی ہمارے یہاں فروری میں جو سیمینار ہے اس میں بطور مہمان تو آپ آ ہی رہی ہیں آپ تانیا کو بھی ساتھ میں لیتی آئیں، یہ بھی ریسرچ پیپر پڑھ دے گی'' پروفیسر رینا چونکہ تانیا کو بہت عزیز رکھتی تھیں اسی لیے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔

''ہاں ہاں ضرور۔ تانیا میرے ساتھ آئے گی۔''

پھر چند لمحوں کے بعد دونوں اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گیے اور تانیا اجازت لے کر باہر چلی آئی

لیکن ابھی بھی اس کے ذہن و دل میں ایک عجیب سی کشمکش نے ڈیرا جما رکھا تھا آج وہ آنے والے مہمانوں سے بھی ملی، ان سے باتیں کیں اور انھیں سمجھنے کی کوشش کی، کہ ان میں پروفیسر ترپاٹھی جیسے کتنے لوگ ہیں۔ کل ڈنر کے وقت اس نے پروفیسر ترپاٹھی اور رینا ملک کو جن کیفیت سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا وہ اب تک اس کے ذہن میں موجود تھا اور اسی چیز نے تانیا کے سوچنے کے طریقے میں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔

اس دن سیمینار جلدی ختم ہو گیا تھا سب لوگ ہال کے باہر نکل رہے تھیں کہ اچانک اس کی نظریں پوجا پر ٹھہر گئیں۔ جو اسی کی طرف چلی آ رہی تھی

پوجا۔۔۔۔اس کی ایک قریبی دوست تھی جو اسی کے ساتھ ریسرچ کر رہی تھی۔ وہ پرانی قدروں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے نئی قدروں کی دلدادہ بن گئی تھی اس کے نزدیک اپنی آزادی سب سے اہم تھی، پھر چاہے وہ ذہنی آزادی ہو یا پھر جسمانی آزادی۔

پوجا اس کے پاس آتے ہی اس سے لپٹ گئی پھر دونوں میں باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔

کچھ دیر بعد دونوں کینٹین میں بیٹھی ہوئیں کافی کی سپ لے رہیں تھیں۔ پوجا اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیوں تانیا تجھے اب تک کوئی ملا یا نہیں''

تانیا کچھ جھینپتے ہوئے بولی ''چل یار میں نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں''

''ارے یار سوچا نہیں تو پھر سوچ، تانیا زندگی بہت چھوٹی ہے اسے Enjoy کر، زندگی ایک بار گزر گئی تو پھر واپس نہیں آئیگی''

''ہاں یہ تو ہے کہ زندگی دوبارہ نہیں ملے گی، لیکن کیسے Enjoy کروں پوجا''

''بس یہی کہ تم کسی کو دوست بنا لو، ان کے ساتھ گھوم و پھرو، موج مستی کرو'' پوجا نے سمجھاتے ہوئے کہا

پوجا پھر بولی ''دیکھو تانیا وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی بہت ضروری ہے، تم بھی اپنے آپ کو تبدیل کرو، روایتوں کو چھوڑو اور زندگی کھل کر جیو، تانیا کیا کبھی تم نے سوچا کی God نے ہمیں یہ جسم کس لیے دیا ہے یہ بس مزے لینے کے لیے ہے اور تانیا تم مجھے دیکھو کہ میں

زندگی کے بھرپور لطف اٹھارہی ہوں، میرے پاس کئی دوست ہیں''
تانیا چونک پڑی'' کیا، کئی دوست ہیں''
پوجا ہنستے ہوئے بولی'' ہاں یہی کوئی دوتین''
تانیا تعجب سے'' اچھا تو دوتین کو سنبھالتی کیسے ہو''
پوجا اس کے حیرت سے بھرے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی'' ارے یار دوتین کو سنبھالنا کون سی بڑی بات ہے ۔ یہ ہے نا'' اس نے موبائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا
'' تانیا بہت سی لڑکیوں کے تو پانچ پانچ ، چھ چھ بوائے فرینڈ ہوتے ہیں ۔جنھیں وہ مینج کرتی ہیں ''
"O'My God.Is it True?" تانیا ہکا بکا ہوتے ہوئے بولی
"Yes Of course Taniya"'' یہ سب بھرپور زندگی کا مزالے رہی ہیں اور ساتھ میں اپنے دوستوں سے کافی کچھ حاصل کر رہی ہیں''
'' مطلب، کیا حاصل کررہی ہیں''
پوجا آہستہ سے بولی "Easy Buck"
تانیا پر سکتہ سا طاری ہوگیا اور وہ کچھ دیر تک آنکھیں پھاڑے پوجا کو دیکھتی رہی اور پھر پوجا کے کان میں آہستہ سے بولی
'' اچھا پوجا اگر ایسے میں کچھ گڑبڑ ہوجائے تو کیا ہوگا''
یہ سن کر پوجا نے اپنا ہاتھ ماتھے پر مارا اور اس کو غور سے دیکھتے ہوئے اس کو قریب کرتے ہوئے آہستہ سے بولی'' تانیا تو تو بالکل پاگل ہے، تجھے پڑھائی کے علاوہ کچھ نہیں معلوم ۔تو ٹی ۔ وی نہیں دیکھتی کیا، اس میں احتیاط برتنے کے لیے کرنی چیزیں دکھاتے ہیں
تانیا ان باتوں سے کوفت محسوس کرنے لگی تھی ۔اسی لیے اس نے ان باتوں سے چھٹکارہ پانے کے لیے بات بدلتے ہوے کہا
'' پوجا تم آج آئیں دودن سے کہاں تھیں''
'' ہاں بس نہیں آسکی، میں ایک دوست کے ساتھ باہر گھومنے چلی گئی تھی''
تانیا کو پھر ایک شدید جھٹکا لگا ۔لیکن وہ خاموشی سے اس جھٹکے کو سہہ گئی
'' اچھا سیمینار کے دودن کیسے رہیں'' پوجا نے سوال کیا
'' بہت اچھے، کافی اچھے آرٹیکل پڑھے گیے ۔اچھی بحثیں ہوئیں اور بھی بہت کچھ'' یہ کہتے کہتے تانیا چپ سی ہوگئی کہ اس کے سامنے پھر سے وہی نظارے آگئے ۔
'' او، مجھے افسوس ہے کہ میں نہ رہی ،لیکن تمھارا اور بھی بہت کچھ سے کیا مطلب ہے''
تھوڑی دیر خاموشی کے بعد تانیا اسے پروفیسر رینا ملک اور پروفیسر ترپاٹھی کی Activites کے بارے میں بتانے لگی ۔
اسے لگا تھا کہ پوجا اس بات کو سن کر اچھل پڑے گی ۔لیکن پوجا کے اوپر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑا بلکہ وہ تانیا سے بولی ۔'' دیکھو تانیا یہ سب زندگی کا ایک حصہ ہے جیسا چل رہا ہے، چلنے دو، تم اسے بدل نہ سکوگی اور نہ ہی اس کا ذکر کسی اور کے سامنے کرنا ، ورنہ تمھیں بھاری پڑسکتا ہے، بات رینا ملک تک پہنچ سکتی ہے ۔''
تانیا نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا'' OK''
'' اچھا پوجا فروری میں کانپور میں ایک سیمینار ہے میں نے اس کا ذکر آج ہی ، پروفیسر ترپاٹھی سے سنا ہے اور انھوں نے مجھے بھی انوائٹ کیا ہے''
'' اچھا تو پھر تم جاؤ گی''
'' معلوم نہیں گھر والے بھیجنے کے لیے راضی ہونگے یا نہیں، اجازت لینی پڑے گی''
'' اچھا تانیا تم جاؤ گی تو میں بھی چلوں گی'' پوجا نے بڑے اشتیاق سے کہا
'' ہاں میم سے بات کرلینا'' تانیا نے کہا
پوجا کچھ سوچتے ہوئے بولی'' ہاں دیکھتی ہوں، ورنہ میں تو یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ اگر پروفیسر ترپاٹھی کا نمبر مل جائے تو سیدھی ان سے ہی

بات کر لی جائے''
کافی ختم کر کے وہ دونوں کینٹین سے باہر آ گئیں اور ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے رخصت ہو گئیں۔
حسب پروگرام کانپور میں سیمینار ہوا۔ پروفیسر رینا ملک کے کہنے پر تانیا کو بہت مشکل سے کانپور جانے کی اجازت ملی، یہ دونوں جب وہاں پہنچیں تو پوجا پہلے سے وہاں موجود تھی، پروفیسر رینا ملک اسے وہاں دیکھ کر تعجب سے بولیں۔
''پوجا تم یہاں؟''
''ہاں میم دراصل ہم کانپور اپنے رشتے داروں میں آئے تھے، پھر ہم نے سوچا کہ سیمینار بھی Attend کر لیں''
''او'' پروفیسر رینا ملک نے کچھ مسکراتے ہوئے کہا
''اچھا پوجا تمھارے Relatives کا گھر یہیں پاس میں ہے؟''
''نہیں میم ان کا گھر کافی دور ہے اسی لیے مجھے پروفیسر ترپاٹھی نے آج Guest House میں ہی رہنے کے لیے کمرہ دلوادیا ہے''
پھر پروفیسر رینا ملک تانیا کے ساتھ پروفیسر ترپاٹھی کے کیبن میں چلی گئیں اور پوجا سیمینار ہال میں بیٹھ گئی۔
ایک دن کا ہی سیمینار تھا جس میں پروفیسر رینا ملک مہمان خصوصی بنائی گئی تھیں اور تانیا نے ریسرچ اسکالر کے طور پر پیپر پیش کیا تھا، شام پانچ بجے تک سیمینار ختم ہوا اور سب لوگ اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیے
پروفیسر رینا ملک کے ساتھ تانیا Guest House میں آ گئی تھی ۔پوجا ایک دوسرے روم میں ٹھہرائی گئی تھی
رات کے آٹھ بجے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی، تانیا نے جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھولا، پروفیسر ترپاٹھی نظر آئے۔
پروفیسر ترپاٹھی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پروفیسر رینا ملک سے بولے
''پروفیسر رینا آج آپ ہماری مہمان ہیں چلیے آج آپ کو کہیں ڈنر کرالائیں''
پروفیسر رینا ملک کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے انھوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا
''پروفیسر ترپاٹھی آپ کا شکریہ، ہم آپ کے ساتھ چلتے لیکن چونکہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے،، اسی لیے آپ تانیا کو لے جائیں''
تانیا نے جیسے ہی سنا وہ گھبرا گئی اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا لیکن تانیا نے جیسے ہی پروفیسر ترپاٹھی کے پیچھے پوجا کو کھڑا دیکھا، وہ بھی ڈنر میں جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ ڈنر سے پہلے وسکی آئی اور میز پر گلاس سج گئے - تانیا سناٹے میں آ گئی اس کے سامنے بھی گلاس رکھا گیا لیکن اس نے سختی سے انکار کرتے ہوئے اپنے سامنے سے گلاس ہٹا دیا، پوجا نے تانیا کو مناتے ہوئے کہا'' تانیا اس میں نشہ نہیں ہے یہ تو Soft Drink ہے''
''نہیں پوجا پھر بھی میں Drink نہیں کروں گی''
پھر سب لوگ Drink کرنے لگیں، Drink کرتے کرتے اتفاق سے بات جنسی موضوعات پر نکل آئی پھر اس موضوع پر کھل کر باتیں ہونے لگی، مگر تانیا اس بحث میں شامل نہ ہوئی، اس بحث کے درمیان وہ خود میں ہی سمٹی جا رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ زمین شق ہو جائے اور وہ اس میں سما جائے۔لیکن اب وہ وہاں سے جا بھی نہیں سکتی تھی اور نا ہی اس بحث میں شامل ہو سکتی تھی، ان باتوں کے درمیان وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئی۔
اس نے سوچا کہ وقت کتنی تیزی سے بدلا ہے جن موضوعات پر لوگ باتیں نہیں کر سکتے تھے انہیں موضوعات پر محفل میں بیٹھ کر بحث کی جانے لگی ہے۔ پوجا کو اس بحث میں برابر کا شریک پا کر وہ سوچ رہی تھی کی اب عورتیں بھی شاید آزادی کی آخری منزل تک پہنچ گئیں ہیں۔ تانیا ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ پارٹی ختم ہو گئی اور یہ سب لوگ اٹھے اور ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ کار میں بیٹھ کر یہ لوگ جب Guest House پہنچے تو

تانیا تیزی سے گاڑی سے اتری اور تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ پوجا تانیا کو آواز دیتی رہ گئی

تانیا جب کمرے میں پہنچی تو غالباً پروفیسر رینا ملک سو چکیں تھیں۔ تانیا نے اپنے کمرے کو بند کیا اور بستر پر لیٹ گئی۔ مگر اب اس کی آنکھوں میں نیند کہاں تھی۔ اس کی آنکھیں تو زندگی کے مختلف رنگوں کو دیکھ کر خیرہ ہو چکی تھیں اور ان ملے جلے رنگوں نے اس کی آنکھوں کی نیند اڑا دی تھی۔ تانیا نے سونے کی بہت کوشش کی مگر کسی صورت اسے نیند نہ آئی۔ وہ ڈری سہمی اپنے بستر پر لیٹی رہی، پھر اچانک اسے کسی دروازہ کھلنے کی آہٹ سنائی دی وہ چونک گئی۔ اس نے وال کلوک پر نظر ڈالی، دو بجے تھے۔ اس نے اپنے اوپر سے چادر ہٹائی اور پانی پینے کے لیے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے فریج کھولا اور ایک بوتل سے گلاس میں پانی نکال کر پی لیا اور بستر کی طرف بڑھی کہ اچانک اسے پھر باہر سے کچھ آہٹ سنائی پڑی۔ اس نے کھڑکی پر سے پردہ ہٹایا اور باہر کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ تب اس کی نظریں سامنے والے دروازے پر پڑیں جو کھلا ہوا تھا اور اس کے باہر پروفیسر ترپاٹھی پوجا کے گلے میں باہیں ڈالے کھڑیں نظر آئے، یہ دیکھتے ہی وہ سکتے میں آ گئی اس نے دیکھا کہ پوجا عجب حال میں ہے بال بکھرے ہوئے ہیں، اس کے بے ترتیب کپڑے بھی کچھ اشارہ کر رہے تھے اسے دیکھ کر لگا کہ پوجا کسی اور دنیا میں ہے۔ لڑکھڑاتے قدموں سے پروفیسر کے قریب آئی اور انھیں گڈ نائٹ کہہ کر آہستہ قدموں سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تانیا نے کھڑکی کا پردہ برابر کیا اور اپنے بستر پر آ گئی۔ اس کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا وہ پھر اٹھی اور فرج کھول کر ایک گلاس ٹھنڈا پانی نکالا اور پی گئی لیکن اس کے حواس اب بھی درست نہیں ہو رہے تھے۔ اسے شدید گرمی کا احساس ہوا۔

وہ خاموش لیٹی رہی۔ تب ہی اچانک کسی نے دستک دی۔ وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ پروفیسر رینا ملک نے دروازہ کھولا۔

''سوری ریناجی میں نے سوچا اگر آپ جاگ رہی ہیں تو طبیعت پوچھ لوں۔''

''اب ٹھیک Feel کر رہی ہوں۔ سوری میں آج آپ کو کمپنی نہ دے سکی''

''کوئی بات نہیں آپ کی اسکالرز تھیں نا''

''اتنی رات تک آپ یہاں کیا کر رہے تھے؟''

''پوجا کسی طرح چھوڑنے پر راضی ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بہت ذہین اور سمجھدار لڑکی ہے۔ بہت آگے جائے گی۔

''تانیا کا پیپر کیسا لگا؟''

''آپکیو لائیں اپنے ساتھ۔ نہ ڈرنک، نہ انجوائے منٹ۔ ہم دانشوروں سے کچھ حاصل کرنے کا شوق بھی نہیں۔ ایسی لڑکیوں کا سمیناروں میں شرکت کر کے کیا فائدہ''۔

''پہلی بات آئی ہے نا۔ دو چار سمینار اٹنڈ کرے گی تو پھر ماحول میں ایڈجسٹ ہو جائے گے''

''جب تک یہ اسکالرز ہیں ہمیں فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

پوجا تو Extra ordinary لڑکی نکلی۔ رات کے دو بجا دیئے۔'' پروفیسر رینا ملک نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''اچھا۔ آج کا دن توقع سے زیادہ بہتر گزرا۔ کافی تھک گیا ہوں۔ گڈ نائٹ''

پروفیسر ترپاٹھی نے پروفیسر رینا ملک کو لپٹا لیا۔ گڈ نائٹ۔

اسے اپنا جسم کانپتا ہوا محسوس ہوا پھر نہ جانے کب وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

اچانک اس کی نیند ٹوٹ گئی وہ کوئی عجیب سا خواب دیکھ رہی تھی ایک ایسا خواب جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا

اس کے چہرے پر شرم کی لالی دوڑ گئی اس نے اپنا چہرہ اپنی بانہوں میں چھپا لیا۔

☆☆☆

امتیاز احمد علیمی

گنجینۂ معنی کا طلسم

بیسویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں جن جینوئن تخلیق کاروں کی کھیپ سامنے آئی ان میں طارق چھتاری کا نام انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔وہ بنیادی طور پر ایک فکشن تخلیق کار ہیں۔اب تک ان کے ایک ہی افسانوی مجموعہ'باغ کا دروازہ' نے ان کو شہرت دوام کے ساتھ معراج کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔معراج کی بلندیوں پر کہنے کا جواز یہ کتاب ہے جس کو حامد رضا صدیقی نے ترتیب دیا ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ اردو کے نامور اور معتبر ادبا و ناقدین نے طارق چھتاری کی تخلیقات کو بہت ہی باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کیا اور اس کی روشنی میں ان کے فکر و فن پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے افسانے کے فنی لوازمات کی روشنی میں ان کے معائب و محاسن کی نشاندہی کی۔اردو فکشن کی دنیا میں بہت کم ایسے تخلیق کار ہیں جو اپنے ایک مجموعے کی بنیاد پر ادب میں اپنی ایک انفرادی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔یہ اختصاص جہاں تک مجھے علم ہے طارق چھتاری کے علاوہ کسی اور تخلیق کار کے حصے میں اب تک نہیں آئی ہے۔یہ بڑی بات ہے اور ایک جینوئن تخلیق کار کی شناخت بھی ہے۔زود نویسی ایک ایسی صفت ہے جو بہت سے تخلیق کاروں کی تخلیقات کو آفاقیت بخشنے میں ناکام بنا دیتی ہے۔زود نویس تخلیق کاروں کو وقتی اور سستی شہرت تو مل جاتی ہے لیکن ادب کے اعلیٰ اور معیاری اصولوں پر جب ان کی تخلیقات کو پرکھتے ہیں تو وہ کھوٹا سکہ ثابت ہوتی ہیں۔ایسی تخلیقات کی مدت اخباری ہوتی ہے۔لیکن جب ہم طارق چھتاری جیسے فکشن نگاروں کی تخلیقات کا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو یہ کہنے میں ذرا بھی تردد نہیں ہوتا کہ ایسے فن کار صدیوں میں جنم لیتے ہیں۔

طارق چھتاری جیسے فن کاروں کی خوبی یہی ہے کہ ان کے یہاں خود ستائی اور اشتہار بازی کے عناصر کا جہاں فقدان نظر آتا ہے وہیں ان کی شخصیت ان کے نمائشی ذہنیت کی نفی کرتی ہے۔ان کے افسانوں کی قرأت کے دوران یہ بات واضح طور پر کہی جاسکتی ہے کہ وہ کسی ازم کے پابند نظر نہیں آتے۔ان کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کی جہاں نمائندگی دیکھنے کو ملتی ہے وہیں جدیدیت کی کہیں واضح اور کہیں مبہم نقوش بھی تلاش کئے جاسکتے ہیں، رہی بات مابعد جدید ڈسکورس کی تو ان کے افسانوں میں اس کے واضح اثرات نظر آتے ہیں جن کی مختلف مضامین میں ناقدین نے نشاندہی کی ہے۔اس کتاب میں شامل تمام مضامین کے مطالعہ کی روشنی میں مذکورہ بالا باتیں کہی گئی ہیں۔طارق چھتاری کے افسانوں میں تہذیبی وثقافتی بیانیہ ہو یا نوآبادیاتی تناظر، قدیم وجدید تہذیبی وثقافتی تصادمات ہوں یا طبقاتی کشمکش، اقداری رویے ہوں یا مشترکہ وراثت، جاگیردرانہ نظام ہو یا زمیندارانہ سسٹم، معاشی ابتری کے مسائل ہوں یا مزدور ومفلوک الحال عوام کے دکھ درد، حسن وعشق اور رومان پرور فضا کی داستان ہو یا جنسی بے راہ روی، سماج کی خود ساختہ اور فرسودہ رسمیات ہوں یا سماجی جبر وتشدد، خود شناشی کا مسئلہ ہو یا نفسیاتی پیچیدگی۔مختصر یہ کہ ایک ہی مجموعے میں بظاہر جتنے موضوعات ہوسکتے تھے ان سب کو سمیٹنے کی بھرپور اور کامیاب ترین کوشش دیکھنے کو ملتی ہے۔مذکورہ بالا موضوعات کو برتنے میں طارق چھتاری نے جو اسلوب اور تکنیک استعمال کیا ہے وہ بظاہر سادہ اور سلیس لگتا ہے لیکن وہ اپنے اندر کتنی معنوی تہہ داری لیے ہوئے ہے مطالعے کے دوران اس کے ڈکشن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔نئے

موضوعات کو برتنے میں جو طرز اسلوب اختیار کیا ہے اس کا انداز بالکل نیا ہے۔ان کا لہجہ اور اسلوب دونوں کسی کا چربہ نہیں ہے بلکہ یہ ان کا اپنا طرز خاص ہے جو انھیں ان کے معاصرین میں امتیازی شناخت دیتا ہے۔

طارق چھتاری کے افسانوں میں جہاں داستانوی رنگ و آہنگ کی جھلک نظر آتی ہے وہیں اساطیری فضا کا بھی گمان ہوتا ہے۔اس کے علاوہ افسانوں کو پڑھتے ہوئے مختلف مقامات پر تمثیلی اسلوب،علامتی طرز اظہار اور استعاراتی نظام کی برمحل کڑیاں جدیدیت سے جوڑ دیتی ہیں جس سے ان پر کبھی جدیدیے ہونے کا گمان گزرتا ہے۔لیکن یہ بات مذکورہ بالا سطور میں کہہ چکا ہوں کہ وہ کسی ازم کے پابند نہیں ہیں۔ان کی تخلیقات کو کسی ایک خانے میں رکھ کر پرکھنا اور کسی خاص ازم کا لیبل لگا کر محدود کر دینے سے ان کے ساتھ انصاف کبھی بھی نہیں کیا جا سکتا۔اگر ہندوستان کی کثیر لسانی وثقافتی اور مشترکہ وراثت کی بازیافت کرنی ہو یا اسلوبیاتی تنوع دیکھنی ہو تو طارق چھتاری کے افسانے پڑھیے اس لیے نہیں کہ میں کہہ رہا ہوں بلکہ اس لیے کہ ان کی تخلیقات کو اردو ادب کے بڑے اور معتبر ادیبوں نے کھل کر اظہار خیال کیا ہے اور ان کی سراہنا بھی کی ہے۔ان کی تخلیقات میں آپ کو سب کچھ ملے گا۔'آدھی سیڑھیاں' بھی ملیں گی اور Irony of Society کا 'پورٹریٹ' بھی۔'صبح کاذب' کی فضا میں مزدوروں اور کسانوں کا بہتا پسینہ بھی ملے گا اور مہاجنی نظام کے استحصالی مناظر بھی۔''تین سال' اور 'دس بیگھے کھیت' کے چلے جانے سے ٹھاکر ویدرام کی المناک تصویر کے ساتھ چھدا کی بربادی کا نقشہ بھی ملے گا۔'برف' 'پانی'،'گلوب'،'شیشے کی کرچیں'،'دھوئیں کے تار'،'آن بان'،'نیم پلیٹ'،'لکیر'،'کھوکھلا پہیہ'،'چابیاں'،'بندوق' سب میں وہ تمام باتیں ملیں گی جن کا اجمالی ذکر میں نے اوپر میں کیا ہے۔بہرکیف حالیہ دنوں میں اردو ادب کے ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر اور تنقیدی فکر کے حامل اسکالر ڈاکٹر حامد رضا صدیقی نے طارق چھتاری کی تخلیقی اور فکری وفنی ارتقا کو دیکھتے ہوئے اپنی محنت شاقہ، لگن، دلچسپی، دلجمعی اور دیدہ ریزی کیساتھ جگر سوزی کے مرحلے کو طے کر کے اس کتاب کو ترتیب دے کر اپنی ذہانت، سنجیدگی اور تنقیدی بصیرت کی نمایاں مثال قائم کی ہے۔ اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔صاحب کتاب کی جملہ صفات کا اندازہ چالیس سے زائد صفحات پر مشتمل ان کے پرمغز مقدمے سے لگایا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے طارق چھتاری کے افسانوں کا تجزیہ پیش کرنے کے ساتھ ان کے افسانوں میں کتنے ڈائمنشنس ہیں یا ہو سکتے ہیں تفصیل سے احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس طرح کا کام وہی اسکالر کر سکتا ہے جسے ادب کی پرکھ ہو۔مقدمے کو پڑھتے ہوئے یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ صاحب کتاب ادب کے پارکھی ہیں۔انھوں نے 'طارق چھتاری: گنجینہ معنی کا طلسم' ترتیب دے کر ہم جیسے اسکالرس کے لیے بڑا کام کیا ہے۔ بڑا کام اس لیے ہے کہ اس مصروف ترین اور برق رفتار عہد میں چوٹی کے ادیبوں سے مضامین لکھوانا وہ بھی مفت میں میرے نزدیک بہت بڑی بات ہے۔لیکن یہ بڑی بات حامد رضا صدیقی نے کر دکھایا ہے جس سے مستقبل میں ان سے اور بڑے اور اہم کام کی امید کی جا سکتی ہے۔اس کتاب کو دو حصوں میں ترتیب دیا گیا ہے پہلے حصے میں طارق چھتاری کے افسانوی مجموعے کی روشنی میں ان کے فنی وفکری امتیازات کو افسانے کے فنی اصولوں پر پرکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے جب کہ دوسرے حصے میں ان کے افسانوں کے تجزیے شامل ہیں۔ پہلے حصے میں جن اہم ناقدین کے مضامین بالترتیب شامل ہیں ان میں نظام صدیقی کا 'نئے عہد کی تخلیقیت میں طارق چھتاری کی نئی فکریاتی اور حسنیاتی بازیافت' شافع قدوائی کا 'طارق

چھتاری کے افسانوں میں ثقافتی عرصہ کی تشکیل' سید خالد قادری کا 'طارق چھتاری کے مجموعے باغ کا دروازہ کے حوالے سے (ایک مختصر نوٹ)' مولا بخش کا 'ثقافتی تاخر کا بیانیہ اور طارق چھتاری کا افسانوی زاویہ' محمود ہاشمی کا 'طارق چھتاری کے افسانے' انیس اشفاق کا 'اردو افسانے میں طارق کا امتیاز و اختصاص' حسین الحق کا 'طارق چھتاری اور سید محمد اشرف باغ کے دروازے پر باد صبا کا انتظار' علی احمد فاطمی کا 'ایک ماڈرن صوفی کی کہانی' صغیر افراہیم کا 'طارق چھتاری کا افسانوی سفر' سلیمان اطہر جاوید کا 'باغ کا دروازہ ایک جائزہ' سلام بن رزاق کا 'طارق چھتاری اور ان کے افسانے' عبد الصمد کا 'طارق چھتاری: کہانی سے جڑا ہوا افسانہ نگار' انیس رفیع کا 'طارق چھتاری! آ دھمکے چپکے سے' معین الدین جینا بڑے 'طارق چھتاری: معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود' صلاح الدین پرویز کا 'باغ کا دروازہ: طارق چھتاری اور آنے والا کل' اقبال واجد کا 'طارق چھتاری کے افسانوں کی قدر و قیمت' مشتاق صدف کا 'طارق چھتاری کا افسانہ متن: تعبیری جہات' معید الرحمٰن کا 'جدید اردو ہندی افسانے کا تقابلی مطالعہ' آفتاب عالم نجمی کا 'طارق چھتاری کی افسانہ نگاری: ایک تنقیدی مطالعہ' وغیرہ مضامین شامل ہیں۔ کتاب کا دوسرا حصہ جو تجزیے پر مشتمل ہے ان میں حامدی کاشمیری کا 'نیم پلیٹ: تجزیہ' رتن سنگھ کا 'نیم پلیٹ: تجزیہ' سکندر احمد کا 'باغ کا دروازہ: دروازے کی کلید' کوثر مظہری کا 'افسانہ آن بان کی آزاد قرأت' خالد جاوید کا 'طارق چھتاری کا افسانہ نیم پلیٹ: ایک تجزیہ' صفدر امام قادری کا 'باغ کا دروازہ: ایک تنقیدی تجزیہ' طارق سعید کا 'افسانہ چابیاں، تخلیقی نثر اور فکشن تکنیک کی مسابقانہ رستخیز جہت' امتیاز احمد کا 'پوٹریٹ: ایک عام آدمی کی خاص کہانی' احمد رشید علیگ کا 'طارق چھتاری کے افسانے تہذیبی تصادم کا شناخت نامہ' معید رشیدی کا 'چابیاں: متن کی تفہیم' وغیرہ مضامین شامل ہیں۔ مذکورہ بالا تمام مضامین بہت ہی اہم ہیں اور طارق چھتاری کی تخلیقی افق کی نشاندہی کرتی ہیں۔ امید ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

☆☆☆

''آخری سواریاں' اردو ادب کے صف اول کے ناولوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور ایک سنگ میل

قاضی عبدالستار

سید محمد اشرف

کا نیا ناول

''آخری سواریاں''

صفحات: 209

قیمت: -/250 روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

(مراسلہ نگار کے خیالات سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

جو وہ لکھیں گے جواب میں

مکرمی_____تسلیمات!

سب رس (اکتوبر ۲۰۱۸ء) ملا۔ ساقی فاروقی کا انٹرویو پڑھ کر جی خوش ہوگیا۔ بڑا فن کار یوں ہی عظمت کی منزلیں طے نہیں کرتا۔ جگہ جگہ وہ انکساری کا اظہار کرتے ہیں۔ ساقی نے کیا پتے کی بات کہی ہے ''میری نظموں سے دوسرے شعراء یاد آئیں تو یہ بڑی ناانصافی ہوگی۔ ان کے ساتھ بھی میرے ساتھ بھی''۔ انفرادیت کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہوسکتی۔ ان کے یہ الفاظ بھی قابلِ تعریف ہیں ''مغرب میں رہنے سے آدمی مغرب کا نہیں ہو جاتا۔ اردو شاعری میری عظیم محبت ہے۔ کراچی، لاہور اور دلّی میرے ضمیر میں ہیں۔ روحِ ہندو پاک میری ذات ہے۔ اردو بولنے اور پڑھنے والے میری طاقت ہیں۔ میرے اثر ورسوخ کا دائرہ اردو کے اثر و رسوخ کے دائرے کے علاوہ نہیں''۔ یہ اعتراف ایک بڑی حقیقت ہے۔ آج کل اردو والوں کی یہ کوشش ہونے لگی ہے کہ وہ کسی طرح ہندی اور انگریزی والوں تک پہنچ جائیں۔ اس لیے تراجم پر زیادہ زور دیا جارہا ہے۔ لیکن ہمارے لکھنے والے یہ بھول گئے ہیں کہ ہر زبان کی تہذیب اس کا ذوق اور مزاج مختلف ہوتا ہے۔ اردو لکھنے والوں کی طاقت اردو بولنے اور پڑھنے والے ہیں۔ اس بات کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ ''ڈگر سے ہٹ کر'' بھی دلچسپ ہوتی جارہی ہے۔

محتشم منیر، دہلی

محترم پروفیسر بیگ احساس صاحب!

سب رس اکتوبر 2018ء میں علی احمد فاطمی کا مضمون ''عبدالصمد کے نئے ناول ''جہاں تیرا ہے یا میرا'' کا معروضی وتنقیدی جائزہ'' پڑھا۔ عبدالصمد نے بہت کم وقفے سے کئی ناول لکھے لیکن ''دوگز زمین'' جیسی مقبولیت کسی ناول کو نہیں ملی۔ علی احمد فاطمی نے ''مضامین پریم چند کے سہارے اس ناول پر تنقید کی ہے کیوں کہ وہ نئی تنقید اور نقادوں سے مایوس ہیں۔ پریم چند کا بحیثیت نقاد کوئی مقام نہیں۔ بس ضرورتاً انھوں نے کچھ تاثراتی مضامین لکھ دیئے اب ان مضامین کی روشنی میں جو1930ء کے ناولوں پر لکھے گئے وہ عبدالصمد کے 2018ء میں لکھے گئے ناول پر تنقید لکھ رہے ہیں۔ آخر وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں یہ کہ آج کا فن کار1930 کے فن کاروں سے آگے نہیں بڑھا؟ اس کا جواز وہ یہ پیش کررہے ہیں کہ پریم چند اور عبدالصمد دونوں گہرا سماجی شعور رکھتے ہیں۔ آگے چل کر وہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ ''سوالات اور مکالمات سے امریکی سماج کی نئی سوچ پر روشنی پڑتی ہے جو معلوماتی تو ہے لیکن ناول میکانکی صورت میں تبدیل ہونے لگتا ہے ناول کم سماجی دستاویز زیادہ لگنے لگتا ہے'' وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ناول عبدالصمد کے سابقہ ناولوں سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ آگے کی منزل ہے۔ تو پھر تنقید کے لیے پریم چند کے مضامین کو معیار کیوں بنایا گیا....؟ حیرت ہوتی ہے کہ اردو کا ایک پروفیسر اب بھی پریم چند، رال فاکس، ورجینا وولف کے حوالے دیتا ہے جب کہ تنقید کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ انھیں عبدالصمد کے فن میں کرشن چندر، منٹو اور انتظار حسین کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ وہ ناول میں کسی عیب کی نشان دہی کرکے فوراً پردہ پوشی کرنے لگتے ہیں۔ انھوں نے سارا زور اس پر صرف کیا کہ عبدالصمد کا تعلق پریم چند اسکول سے ہے۔ علی احمد فاطمی یہ بھول گئے کہ انھوں نے ہی عبدالصمد کے

افسانوں کا مجموعہ ''بارہ رنگوں والا کمرہ'' شائع کیا تھا جس میں سارے افسانے جدید تھے۔عبدالصمد اسی وقت پریم چند کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے پھر جدیدیت کے بعد انھوں نے ما بعد جدیدیت کو بھی قبول کیا اور ان کا فن ارتقاء پذیر ہے(وہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور فروغ اردو ادب ایوارڈ، دوحہ، قطر حاصل کرنے والے پہلےفن کار ہیں)۔افسوس ہماری تنقید تاثراتی تنقید سے آگے نہیں بڑھی۔فاطمی صاحب بھی ترقی پسندی کا لیبل لگا کر پرانے علم سے کام چلا رہے ہیں۔امید ہے آپ میرا یہ خط ضرور شائع کریں گے۔

بدر ناصری۔لکھنو

مدیرِمحترم پروفیسر بیگ احساس______السلام علیکم

'سب رس' کے اشاعتی سفر کے تعلق سے میں ذاتی طور پر طمانیت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔اللہ کرے کہ ادارہ ادبیاتِ اُردو کی صحت مند علمی و ادبی روایت کے امین کے طور پر یہ رسالہ صدا جاری رہے۔

ستمبر کا شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ بیگ احساس کا اداریہ عصرِ حاضر کے مقتدر سیاسی طبقہ کی کج ادائیوں اور ناقص منصوبہ بندی پر دال ہے۔اگر چہ اس اداریہ کے حوالے سے مدیر کی زیرکی اور موجودہ ملکی اور بین الاقوامی صورتِ حال پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے لیکن میری ذاتی رائے ہے کہ اس خالص ادبی رسالے کے اداریہ میں ادبی مباحث کو جگہ دینا لازمی ہے کیوں کہ ایک تو سیاسی مسائل پر سیکڑوں رسائل و جرائد موجود ہیں، دوسرے یہ کہ 'سب رس' خالص ادبی رسالہ ہے اس لیے اس کے اداریوں میں ادبی مباحث کو مناسب طور پر پیش کیا جانا لازمی ہے۔ادبی مباحث سے میری مرادعصرِ حاضر کے غالب ادبی رویے اور میلانات، ادبی متون میں مابعد جدید ثقافتی صورتِ حال کی ترجمانی، فکشن کی ثروت مندی، شاعری کی میدان میں نئی نسل کی آہٹ، تھیوری کے نظریاتی مباحث اور عملی دشواریاں ، ادبی صحافت میں اقدار کی تنزلی ؛ وغیرہ ہے۔'سب رس' کے ایک عام قاری کی حیثیت سے میں اپنے ناقص خیالات سے مدیرِ محترم کو آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اس شمارے میں استادِ محترم پروفیسر قدوس جاوید کا مضمون ''دخمہ: تہذیب کی برہنہ نعش اور گِدھ'' نہایت ہی قیمتی محسوس ہوا۔ یہ مقالہ کئی اعتبار سے موجودہ دور کی فکشن تنقید میں نمائندہ تصور کیا جانا چاہیے۔سچ پوچھیے تو دورِ حاضر میں فکشن کے حوالے سے ایسے مقالے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔اس میں مابعد جدید ثقافتی صورتِ حال کے زائیدہ مختلف مسائل اور میلانات کی نشاندہی کر کے بیگ احساس کے افسانوں کے فنی اور فکری معیارات کا محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔اس دوران مقالہ نگار نے کچھ متضاد بیانات بھی پیش کیے ہیں جیسے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ'' ہندوستان میں وارث علوی کے بعد ارتضیٰ کریم کے سوا اور کوئی نہیں ہے جسے اُردو افسانہ (فکشن) کا معتبر محقق اور نقاد گردانا جاسکے''وہیں دوسری طرف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ''بحیثیتِ مجموعی اب اُردو میں ان (گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی) سے بہتر کہنے اور سننے والے بھی اپنی موجودگی درج کروا چکے ہیں، کسی کو خبر ہو کہ نہ ہو۔'' اس طرح کے متضاد بیانات کا سولہ صفحات کے مقالے میں در آنا کسی اچنبھے کی بات نہیں لیکن اس میں معاصر افسانہ نگاروں کے درمیان جس طرح بیگ احساس کی افسانوی انفرادیت کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے وہ مقالہ نگار کی عصری ادبی منظر نامے پر گہری نظر کا غماز ہے۔حالاں کہ بحیثیتِ مدیر بیگ احساس کو اخلاقی طور پر اپنے افسانوی مجموعہ پر مشتمل یہ مقالہ'سب رس'میں شائع نہیں کرنا

چاہیے تھا۔ یہ مقالہ اُردو کے کسی بھی موقر رسالے میں اہتمام سے شائع کیا جاسکتا تھا۔ مدیر کی اخلاقی جرأت کی مثال مشہورِ زمانہ رسالہ ''زمانہ'' کانپور کے مدیر نے اُس وقت پیش کی جب انہوں نے اپنے رسالہ کے حوالے سے جوشؔ ملیح آبادی کی تخلیق کردہ نظم یہ کہہ کر واپس لوٹا دی کہ وہ اپنے ہی رسالے کے متعلق توصیفی نظم شائع کرنے سے معذور ہیں۔ بہر حال یہ فیصلہ مدیر کی صوابدید پر چھوڑ دیا جانا چاہئے۔ اس مقالے میں پروف کی اتنی اور ایسی غلطیاں درآئی ہیں کہ سنجیدہ قارئین کو بھی بھٹک جانے کا احتمال رہتا ہے۔

حمید سہروردی کی افسانہ نگاری پر فیاض رفعت کا مضمون ایک عمدہ فکشن نگار کی تنقیدی صلاحیت کا مظہر ہے۔ رفعت نے اپنے تنقیدی مضمون میں تخلیقی زبان کا جس طرح استعمال کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ناول ''بنارس والی گلی'' زبان کے خلاقانہ استعمال کا احسن اظہار ہوگا۔

مضامین والے حصے میں طیبہ نازلی کا مضمون ''جاپان میں اُردو کے حوالے سے، ہند جاپان کے روابط'' معلوماتی نظر آیا اور اُردو کے فروغ کے حوالے سے امکانات بھی روشن ہوتے نظر آتے ہیں۔

ہر شمارے کی طرح مجھے اس شمارے میں بھی اندرا دیوی دھن راج گیر کے کالم کا انتظار تھا لیکن زیرِ نظر شمارے میں ''آپ بیتی'' کالم کے تحت قارئین کو چونا لگا دیا گیا ہے۔ اس میں اندرا دیوی کے بجائے نواب میر اصغر حسین کی ''یادیں'' پیش کی گئی ہیں۔ مدیر نے اس کالم کی پیشانی پر یہ ذیلی عنوان ''نواب میر اصغر حسین سے گفتگو'' درج کیا ہے لیکن اس کے متن میں صرف یک طرفہ (Monologue) بیانات درج ہیں نہ کہ دوطرفہ (Dialogue) گفتگو۔ اگرچہ اس میں میری دلچسپی کا بہت سامان میسر ہے بلکہ اندرا دیوی کے کچھ کالموں سے بہتر بھی۔

فکشن والے حصے میں ڈاکٹر مشتاق وانی کا افسانہ ''ریٹ لسٹ'' اور طیبہ خاں کا ''بھوک'' اچھے لگے۔ ان افسانوں میں فن کاروں نے مانوس واقعات کو اپنی فنی ہنرمندی سے نامانوس (Defaimilarization) بنا کر جس طرح پیش کیا ہے وہ ان کے افسانوی فن پر گرفت کا مظہر ہے۔

اس شمارے میں خطوط کی عدم موجودگی بُری طرح کھٹکتی ہے۔ گزارش ہے کہ ہر تحریر کے حاشیے میں قلم کار کا پتہ مع موبائل نمبر اور ای میل ضرور درج کریں۔

الطاف انجم۔ کشمیر یونیورسٹی

مکرمی ______ تسلیمات!

سب رس اکتوبر 2018ء ملا۔ آپ کا اداریہ علاقہ پرستی کے بدترین رجحان پر بہترین تاثرات پیش کرتا ہے۔ ساقی فاروقی سے گفتگو شامل کر کے آپ نے انھیں بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا۔ علی احمد فاطمی، شرف النہار، غلام نبی کمار کے مضامین اچھے ہیں۔ خاص طور پہ غلام نبی کمار نے ڈاکٹر عباس رضا نیر کی تنقید کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ بعض نئے لکھنے والوں سے اچھی امیدیں وابستہ ہیں۔ یادیں میں اندرا دیوی دھن راج گیر جی نواب میر اصغر حسین کی زندگی کے اہم واقعات پیش کیے۔ گو اس کا تعلق راج کماری اندرا دیوی سے نہیں ہے لیکن یہ یادیں ماضی کے ایک روشن درخت پیش کرتی ہیں۔ افسانے بے حد کمزور ہے۔ اس جانب آپ کی خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ نظمیں اور غزلیں معیاری ہیں اور دل کو چھوتی ہیں خاص پر پہ پروین شیر کی نظم ''برف کی مورتی'' ایک عجیب سا تاثر قایم کرتی ہے۔

محمد مجاہد علی۔ حیدرآباد

اشرف رفیع

17-7-106, Yakutpura, Hyderabad - 500 023

عبیداللہ ہارون

Research Scholar, Dept of Urdu,

University of Hyderabad Gachibowli,

Hyderabad - 046

عائشہ شاہین

Research Scholar, Department of Urdu

Aligarh Muslim University - Aligarh - U.P.

جاں نثار معین

Research Scholar, Dept. of Women Education

MANUU, Gachibowli, Hyderabad - 500 032

شمس الہدیٰ

Assistant Professor, Deparment of Urdu

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad - 500 032

محمد طارق

Inamdar House, Kholapur

Dist: Amravati - 444 802

ناصر راہی

22, A-Road, Bari Nagar, Dak Khana, Telco

Work, Jamshedpur - 832 004 (Jharkhand)

امتیاز احمد علیمی

Research Scholar, Department of Urdu

Jamia Millia Islamia, New Delhi.

کوثر صدیقی

79-A, Ginnori Main Road, Bhopal - 462 001

اسلم حنیف

P.O. Gunnaur,Dist: Sambhal, U. P. - 243 772

کشور سلطانہ

201, Positive Pavilion, Shantinagar

Hyderabad - 500 028

مصداق اعظمی

Jawma, Mejwa, Phoolpur, Azamgarh

Uttar Pradesh - 276 304

راہی فدائی

16/16 4th Cross Shivampally Layout, HBR 3rd

Block, Kalliyan Nagar Post: Bengaluru - 560 043

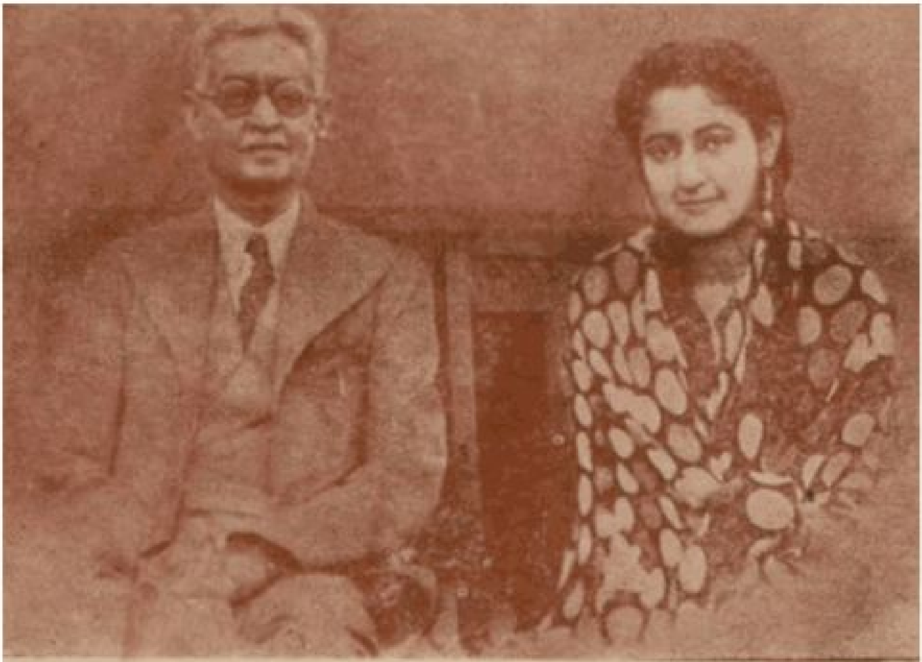

قرۃ العین حیدر　　　سید سجاد حیدر یلدرم

یہ تصویر یلدرم کے انتقال سے صرف تین دن پہلے ان کے مکان کے باغ میں لی گئی تھی!

Regd. No. RNP/HD/970/2018-20 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.80, Issue-11 November, 2018 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Taahaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (T.S.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469